اردو کی قدیم داستانیں

ایم حبیب خاں ایم۔ اے۔ بی ٹی (علیگ)

(یہ کتاب اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے طبع ہوئی)

اشاعت اول: جنوری ۱۹۷۴ء

تعداد: چھ سو

طباعت: حاکم پریس علی گڑھ

ناشر: مصنف

قیمت: Re[illegible] Rs. 4/-

مصنف کی دوسری کتابیں

(۱) اردو کے کلاسیکی شعراء جلد اول تا سوم دکنی سے فراق تک

(۲) بہترین افسانے

(۳) انتخاب کلام جرأت

(۴) اردو تنقید کے معمار

(۵) افکار میر

(۶) مطالعۂ میر

ملنے کا پتہ

انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ

فہرست

اردو کے عظیم محقق اور ماہرِ غالبیات

جناب مالک رام صاحب کے

نام

تعارف

کسی زمانے میں اصلاحی اور افادی تنقید نے داستان کو فرسودہ بے معنی قرار دیا تھا۔ داستان گویوں کے تخیل نے جس طلسمی دنیا کی تخلیق کی تھی اور اس کے کرداروں کی تشکیل میں ان کا ذہن جس نظام اقدار کا پابند تھا اسے حقیقت پسندی کی بڑھتی ہوئی رو نے نہ صرف یہ کہ صداقت سے بعید قرار دیا بلکہ داستانوں کے مطالعے کو ذہنی و اخلاقی صحت کے لئے مضر سمجھا گیا۔

گذشتہ بیس پچیس برسوں میں ہمارے ادبی اور تنقیدی رویوں میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہاں داستانوں سے متعلق یہ انداز فکر بھی تبدیل ہوا۔ جدید تنقید نے داستانوں کو انسان کے اجتماعی لاشعور کا بہترین اظہار اور اس کے پردے میں خوابوں کے جو پیکر تراشے گئے ہیں انھیں تہذیبی مقصدوں کے استعارے سے تعبیر کرکے داستان کا مطالعہ ایک نئے زاویے سے کرنے کی سبیل نکالی۔ بعض ذہین نقادوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جس ملک یا قوم میں داستانوں کا سرمایہ حقیر یا قلیل ہے اسے غیر تخلیقی یا بنجر کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ داستانوں کی رنگا رنگی قوم کے خلاق ذہن کی غماز ہوتی ہے۔

ادبی فکر کے اس بدلتے ہوئے زاویے نے داستانوں سے متعلق تحقیق و تنقید کی لے کو بھی آگے بڑھایا اور ہمارے ادب کا وہ ذخیرہ جو ہماری بے اعتنائی کی وجہ سے کرم خوردہ ہو رہا تھا دوبارہ ہماری توجہ کا مستحق ہو گیا۔

ایم حبیب خاں صاحب انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کے ناظم ہیں۔ انھوں نے پرانی کتابوں کو دیمک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے الماریوں میں بند رکھنے کا ہی معقول انتظام نہیں کیا ہے

بلکہ انھیں بند الماریوں سے نکال کر خود بھی پڑھا ہے اور دوسروں کو انھیں پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کی تحقیق و تنقید ان کے اسی شغلے کی پیداوار ہے۔ جہاں ادب کی دوسری اصناف کی طرف انھوں نے توجہ کی ہے وہاں پرانی داستانوں کو متعارف کرانے کی بھی کوشش کی ہے۔ بعض معروف کتابوں کے نئے پہلو دریافت کیے ہیں اور بعض غیر معروف اور کمیاب کتابوں پر تعارفی مضامین لکھ کر انھیں ادبی حلقوں سے روشناس کرایا ہے۔ موصوف کے متعدد مضامین ادبی رسائل میں شائع ہو کر قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ داستانوں سے متعلق ان مضامین کو اب وہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے ان مضامین سے تحقیق کی نئی راہیں نکلیں گی۔

خلیل الرحمن اعظمی
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ ۱۰ر جنوری ۱۹۷۴ء

اپنی بات

میرے والد مرحوم کو داستان پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر روز گھر پر رات کو دنیاوی مصروفیتوں سے فارغ ہو کر طلسم ہوش ربا پڑھتے۔ ان کے گرد محلے کے باذوق حضرات حلقہ بنا کر داستان سننے جمع ہو جاتے اور رات گئے تک داستان سرائی کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ یہ کوئی ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں لوگوں کی آمدنی محدود تھی لیکن سکون بہت تھا۔ ان ہی میں ایک صاحب علی احمد خاں تھے۔ یہ بڑے ذہین اور باغ و بہار انسان تھے۔ ان کی عمر اس وقت کوئی پچاس پچپن برس کے لگ بھگ تھی۔ یادداشت بلا کی تھی۔ داستان کا قصہ جہاں چھوڑا جاتا اس کی عبارت ان کو یاد رہتی۔ دوسرے دن جب پوچھا جاتا تو حرف بہ حرف پچھلی کی عبارت سناتے اور قصہ آگے بڑھنے لگتا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ میرے والد کبھی کسی کام سے باہر چلے جاتے یا طبیعت خراب ہو جاتی تو وہ ان کی عدم موجودگی میں اپنے ساتھیوں کو سنے ہوئے قصوں میں سے کوئی قصہ اس طرح سناتے کہ سننے والوں کو والد کی عدم موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا۔ علی احمد خاں مرحوم میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ داستان کے کرداروں پر تبصرہ بہت عمدہ کرتے۔ ان کی رائے اس معاملے میں بڑی جچی تلی ہوتی۔ اگر یہ خود بہت پڑھے لکھے ہوتے تو ہمارے داستان گویوں سے سبقت لے جاتے۔

داستان سننے اور پڑھنے کا مجھے بچپن سے شوق رہا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں میں نے طلسم ہوش ربا (شروع کی دو جلدیں) "باغ و بہار"، "فسانۂ عجائب"، "کہانی رانی کیتکی"، "طلسم نادر"، "اخلاق ہندی" اور "بیتال پچیسی" جیسی مشہور داستانیں

پڑھ ڈالیں۔ اور ان کا خاکہ مدت تک میرے ذہن میں قائم رہا۔ بی۔ اے میں ان داستانوں کو پھر پڑھنے کا موقع ملا اور ان کی خوبیوں سے محظوظ ہوا۔ آخر کی دونوں داستانیں اب کمیاب ہیں البتہ کتب خانوں میں ان کے نسخے موجود ہیں "بیتال پچیسی" میں ۲۵ کہانیاں ہیں جو بیتال نامی ایک تیلی نے بھوت بن کر راجہ بکرماجیت کو سنائی تھیں۔ یہ سب کہانیاں بڑی عبرت ناک اور اخلاقی فقروں سے مزین ہیں۔ اس کی ہر کہانی علیحدہ ہے جس کا دوسری کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اصل قصہ سنسکرت میں تھا اس کے بعد اس کا ترجمہ ۱۶۷۸ء میں برج بھاشا میں ہوا اور پھر ۱۸۰۸ء میں فورٹ ولیم کالج میں مظہر علی خاں ولا نے اردو میں ترجمہ کیا۔ "اخلاق ہندی" مفتی تاج الدین کی فارسی کتاب "مفرح القلوب" کا ترجمہ ہے۔ حسینی نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں کیا۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں مگر اب کمیاب ہے۔ اس کی زیادہ تر کہانیاں عبرت آموز ہیں۔ عبارت میں روانی اور سلاست ہے مگر جا بجا پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ یوں تو اس میں قصے بہت ہیں اور کوئی قصہ دلچسپی سے خالی نہیں اس میں مجھے سب سے زیادہ مینڈک اور سانپ کا قصہ پسند آیا۔ قصہ اس طرح ہے۔

"ایک پرانا سانپ کہ جس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی ایک جھیل کے کنارے پر آہستہ آہستہ آ کر غمگین ہو بیٹھا۔ مینڈکوں کے بادشاہ نے اس سے پوچھا "اے سانپ تجھے کیا ہوا ہے جو اتنا دلگیر ہے" اس نے جواب دیا "مجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی نبیڑ"۔ مینڈک بولا "اے سانپ اتنا خوش کیوں ہوتا ہے۔ اگر کچھ تیری چیز پانی میں گر گئی ہو تو کہہ میں اپنے لشکر کو حکم کروں کہ اس چیز کو ڈھونڈ لا دے"۔ میں نے کہا "اے مینڈک! اس شہر میں برہمن کا لڑکا بہت خوبصورت تھا۔ اس کو میں نے کاٹا۔ ماں باپ نے اس کے درد سے کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ اس کے بھائی نے اس کو سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا۔ لیکن

اسے نصیحت کی کہ بھائی صبر کیجئے۔ سب کی یہی راہ ہے ..... تب برہمن
یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اے دوستو! میں اس گاؤں میں نہ رہوں گا۔ کس واسطے
کہ یہی ایک لڑکا میرا تھا سو خدا کی راہ میں گیا۔ اب مجھ سے اور بستی سے کیا
کام، بن باسی ہوں گا" تب انھوں نے کہا "اے بھائی کوئی داڑھی منڈوانے
اور جامہ پھاڑ کر جنگل میں جا رہنے سے سادھو نہیں ہوتا مگر جس کی کرنی اچھی
ہو سوائے مینڈک! میں نے اسی وقت خواب دیکھا کہ ایک مرد بوڑھا
نہایت نیک صورت مجھ سے یوں کہتا ہے کہ اے سانپ تو نے اس غریب
کے لڑکے کو ناحق کاٹا۔ کل قیامت کو تیری پیٹھ پر مینڈک سوار ہوں گے اور
اسی عذاب میں خدا تجھے ہمیشہ گرفتار رکھے گا۔ اگر اس عذاب سے تو چھٹکارا
چاہے تو کنارے جھیل کے جہاں بہت سے مینڈک ہوں وہاں جا کر ان
کے سردار کو اپنی گردن پر سوار کر کے لئے پھرا کر۔ مینڈک یہ بات سنتے ہی
بہت خوش ہو کر اپنے دل میں یہ کہنے لگا کہ خدا نے مجھے مفت یہ گھوڑا دیا۔
شاید میرے طالعوں کی مدد سے ایسی سواری ملی۔ اسی وقت سانپ کی پیٹھ
پر چڑھ بیٹھا اور کہا فلاں جگہ پر میرا دشمن ہے اگر تو تصدیع کر کے مجھے وہاں
تک لے چلے تو میں اسے ماروں۔ سانپ نے یہ بات مان لی۔ تب سب مینڈکوں
کو اپنے جلو میں آگے رکھ لے چلے ..... کسی بہانے سے اپنے تئیں مینڈکوں
کے سردار نے پوچھا۔ تو کیوں گر پڑا؟ اس نے کہا "تیری فوج کو دیکھ کر مجھے
بھوک لگی ہے"۔ اس نے کہا "میرے لشکر سے دو چار مینڈک کھا لے"۔
سانپ نے کہا "اے بادشاہ لشکر کم ہونے سے تجھ کو برا لگے گا" وہ بولا
"تیرے کھانے سے میری فوج کم نہ ہوگی"۔ سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے
لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔ اکیلا بادشاہ رہ گیا۔ سانپ نے پوچھا"

"اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں مجھے بھوک لگی ہے"۔ اس نے کہا "اے نیچ
کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے"۔ تب اس نے کہا "تمہارے
لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے۔ بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب
نہیں تو اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اس کی چھاؤنی میں داخل ہو تو بہتر ہے"
تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپکا ہو رہا۔ سانپ نے اپنے تئیں اس کو زمین پر
پٹک کر کوڑے سے دم کے مارے اور کھا گیا"۔

اس قصے کو پڑھ کر جو تاثر میرے دل پر ہوا اس کا نقش آج تک قائم ہے
ان خرافاتی کہانیوں میں مشاہدے اور تجربے کی ایک دنیا آباد ہے۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں
اچانک میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی وفات کے بعد محلے کی ادبی محفل ختم ہو گئی۔
داستانوں پر میرے یہ مضامین اسی ذوق کی پیداوار ہیں۔

بینی نرائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں تھے ان کی اب تک تین کتابیں
چار گلشن، تنبیہ الغافلین اور دیوان جہاں دریافت ہوئی تھیں۔ ان تینوں کتابوں کا ذکر ادبائے
نثر اردو، تاریخ نثر اردو، گل کرسٹ اور اس کا عہد اور انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب
میں ملتا ہے۔ میں نے ان تین کے علاوہ جو چار کتابیں اس مصنف کی نئی دریافت کی ہیں وہ
یہ ہیں ۱- باغ عشق ۲- بہار عشق ۳- گلزار حسن ۴- گل صنوبر۔ اس طرح جہان
کی کل سات کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں۔ توقع ہے کہ یہ نئی دریافت شدہ کتابیں پڑھنے والوں
کے لئے خاصے کی چیز ہوں گی۔

ایم۔ حبیب خاں

پیش لفظ

داستان گوئی کا فن خاصا پرانا ہے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح نہ سینما تھے نہ کھیل تماشے بلکہ لوگوں کی دلچسپی کا لے دے کے یہی ایک ذریعہ تھا۔ بہت سے صاحب ذوق اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر داستان سننے ایک جگہ جمع ہوتے اور یہ محفلیں روزانہ تین چار گھنٹے تک جاری رہتیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ داستان گو داستان میں زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا تو یہ محفلیں آدھی رات گئے تک جاری رہتیں سننے والے بھی ایسے محو ہو جاتے جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔

اردو میں داستان گوئی کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر سے ہوا۔ اردو میں نثر کی پہلی داستان تحسین کی "نوطرز مرصع" ہے جو ۱۷۷۵ء میں لکھی گئی۔ اس میں چار درویشوں کا قصہ ہے جو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے مگر عبارت بے جان اور ثقیل ہونے کی وجہ سے مقبول عام نہ ہو سکی۔ ۱۸۰۱ء میں اسی قصے کو زرّیں نے بھی "نوطرز مرصع" کے نام سے لکھا۔ تحسین کے مقابلے میں زرّیں کی عبارت کسی قدر آسان ہے مگر مقبول یہ داستان بھی نہ ہو سکی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو داستانیں خاصی تعداد میں لکھی گئیں یہاں تک کہ کالج کی اشاعتوں نے داستانیں پڑھنے کے شوق کو ابھارا۔ مختلف شہروں خاص کر لکھنؤ اور دہلی میں مطابع قائم ہوئے اور داستانیں چھپنے لگیں۔ ۱۸۰۱ء میں میرامّن نے "باغ و بہار" لکھی۔ یہ داستان اتنی مشہور اور مقبول ہوئی کہ آج تک لوگ اس کے ادبی محاسن کے گن گاتے ہیں۔ میرامّن داستان گوئی کے گر سے اچھی

طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے باغ و بہار میں وہ تمام خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک اچھی داستان کا امتیازی وصف ہے۔ اس داستان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان سہل اور آسان استعمال کی ہے۔ تحسین اور زرتین کی داستانوں میں یہ بات نہیں۔ میر امن کی باغ و بہار کو پڑھتے وقت قاری کو بہت سی دلچسپ باتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ میر بہادر علی حسینی کی "نثر بے نظیر" اور اخلاق ہندی"۔ میر شیر علی افسوس کی "باغ اردو"۔ حیدر بخش حیدری کی گلزار دانش" "توتا کہانی" اور قصہ حاتم طائی"۔ مظہر علی خاں ولا کی بیتال پچیسی اور مادھونل اور کام کنڈلا۔ میر کاظم علی جوان کی "سنگھاسن بتیسی"۔ حفیظ الدین کی خرد افروز۔ خلیل علی خاں اشک کی داستان امیر حمزہ۔ بینی نرائن جہاں کی چار گلشن اور باغ عشق"۔ مرزا جان طپش کی "بہار دانش" جیسے مشہور معروف قصے فورٹ ولیم کالج میں لکھے گئے۔ ان قصے کہانیوں کا زمانہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔

اس کالج سے الگ ہٹ کر بھی بہت سے قصے کہانیاں لکھی گئیں۔ انشاء نے ۱۸۰۳ء میں "کہانی رانی کیتکی" لکھی۔ اس میں انشاء نے زبان و بیان کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ ہمیں دوسری داستانوں میں نہیں ملتے۔ ۱۸۱۳ء میں مہجور نے نورتن لکھی اور ۱۸۲۴ء میں سرور نے "فسانہ عجائب" لکھی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف شہروں میں داستانیں لکھی گئیں۔ لیکن داستان لکھنے کے مراکز زیادہ تر لکھنؤ، دلی اور کلکتہ ہوا تھے۔ کلکتہ میں میر امن نے اپنی لافانی داستان "باغ و بہار" کی چمن بندی کی تو لکھنؤ میں سرور نے فسانۂ عجائب کا پرچم لہرایا اور دلی میں میر باقر علی نے اپنی داستانوں کے ذریعہ نت نئے پھول کھلائے۔ سرور نے باغ و بہار کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ لگا کر فسانۂ عجائب لکھی گو کہ یہ کتاب باغ و بہار سے ۲۴ سال بعد لکھی گئی لیکن میر امن کی سادگیٔ بیان کو سرور نے ضبط تحریر میں لائے تو فسانۂ عجائب

کو وہ مقبولیت نہ ہوتی جو آج ہے اس لئے انھوں نے سادگیٔ بیان سے الگ ہٹ کر رنگینیٔ بیان کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور مصنوعی چیزوں کا سہارا لے کر فسانۂ عجائب کو مکمل کیا - میر امن کی "باغ و بہار" اپنے اسلوب نگارش اور سادگیٔ بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی - غرض داستانوں کا یہ سلسلہ ایسا چلا کہ ۱۹۲۹ء تک جاری رہا - دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے -

داستانوں کے مطالعے سے ہمیں اس زمانے کے لوگوں کی تہذیب، رہن سہن طور طریق اور سماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے - داستان گو اپنے طرز کی رنگینی اور بلند خیال کی وجہ سے مختلف رنگوں سے تصویر کی مصوری میں ایسے رنگ بھرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی رنگینیٔ بیان سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا -

اس مجموعے میں تمام مضامین اردو کی قدیم داستانوں پر ہیں - یہ مضامین کچھ پرانے، کچھ نئے اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں - "باغ عشق" اردو کی غیر مطبوعہ داستان ہے جو میری دریافت ہے - اس کے علاوہ "بینی نرائن جہاں کی بہار عشق"، "گلشن حسن اور گل صنوبر" بھی میری دریافت کی ہوئی داستانیں ہیں - خطا کا تحقیق سے خاص رشتہ ہے اور اگلوں کی تحقیق نے پچھلوں کی رہ نمائی کی ہے اس لئے اس میں فرو گذاشت ہو سکتی ہے -

میری یہ کتاب اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے طبع ہوئی ہے - اس کے لئے میں بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ صدر اردو اکیڈمی اور صباح الدین صاحب عمر سکریٹری کا خصوصیت سے شکر گزار ہوں جن کے تعاون سے یہ مجموعہ اشاعت کا باعث ہوا -

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر ہیں - موصوف نے اپنی مصروفیات کے باوجود کتاب کے مسودے کی ایک ایک سطر پڑھی

اور اس کے لیے تعارف لکھا۔ میں اس زحمت کے لیے موصوف کا شکر گزار ہوں۔

اردو کے عالم اور محقق ڈاکٹر نثار الدین احمد ارزو، جناب خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی اور ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں شروانی نے نہ صرف مجھے مفید مشورے دیئے بلکہ اس کتاب پر اپنی رائے دیکر کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا۔ میں ان حضرات کا ممنون و شکر گزار ہوں۔

دوستوں میں شہریار صاحب۔ انصار اللہ صاحب۔ سمیع اللہ صاحب اشرفی، اطہر پرویز صاحب اور ضمیر الدین صاحب قریشی کے خلوص اور مشوروں نے مجھے بہت متاثر کیا اور ان کی علم دوستی سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ عزیزی شفیق میاں نے طباعت کے سلسلے میں میری بڑی مدد کی۔

ڈاکٹر معین احسن جذبی اردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار ہیں۔ اردو داستانوں پر انھوں نے عرصہ ہوا کام شروع کیا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر ان کا کام مکمل نہ ہو سکا مجھے موصوف سے داستانوں کے سلسلے میں مفید مشورے ملے۔ جن کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں اپنے رفیق سید تفضل حسین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کے مشوروں نے کتاب کو اختتام تک پہنچانے میں میری مدد کی۔

علی گڑھ ۲۵، جنوری سنہ ۱۹۷۷ء

ایم حبیب خاں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

(جذبی)

طلسم نارنج

داستان گوئی بڑا دلچسپ اور پر لطف فن ہے۔ دیسے تو یہ ہر ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اس فن کی حیثیت خاص بلند رہی ہے عرب میں بے شمار داستانیں لکھی گئیں لیکن جو شہرت الف لیلا دلیلا کو ملی وہ دوسری داستانوں کو کم نصیب ہوئی۔ اس کے کئی ترجمے اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ ترجموں میں ڈاکٹر ابو الحسن منصور احمد مرحوم کا ترجمہ سب سے اچھا ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے ان سب جلدوں کو علیحدہ علیحدہ شائع کیا تھا۔ اصل میں عرب کی داستان گوئی کا شاہکار الف لیلہ دلیلہ ہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج شباب پہ تھا۔ لکھنؤ داستان گوئی کا سب سے بڑا مرکز تھا ویسے دہلی اور رامپور بھی داستان گوئی کے مرکز تھے۔

اس زمانے میں منشی محمد حسین جاہ لکھنوی اور منشی احمد حسین قمر لکھنوی بڑے مشہور داستان گو تھے۔ لکھنؤ میں ان کا بڑا دور دورہ تھا۔ جاہ نے منشی نولکشور مالک نولکشور پریس کی فرمائش پر "طلسم ہوش ربا" کی شروع کی چار جلدیں لکھی یا ترجمہ کی تھیں۔ ان چار جلدوں کی تکمیل کے بعد منشی نولکشور سے معاوضے کے سلسلے میں کچھ جھگڑا ہو گیا جس کی بنا پر وہ منشی گلاب سنگھ لاہوری کے مطبع میں چلے گئے۔ اس کے بعد "طلسم ہوش ربا" کی باقی جلدیں قمر نے ترجمہ کیں۔ اس طرح "طلسم ہوش ربا" کا کل سات جلدوں میں ترجمہ مکمل ہوا۔ بعد میں

قمر نے "بقیہ طلسم ہوش ربا" کے نام سے دو جلدیں علحدہ سے اور تصنیف کیں۔ "طلسم ہفت پیکر" (تین جلدیں)، "نوماں نامہ"، "طلسم خیال سکندری" (تین جلدیں) "طلسم فتنۂ نور افشاں" (تین جلدیں)، "طلسم نارنج" اور "طلسم نوخیز جمشیدی" (تین جلدیں) جیسی ضخیم اور دلچسپ داستانیں بھی قمر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اور انھیں زندہ رکھنے کے لئے یہ کافی ہیں۔ قمر "طلسم نوخیز جمشیدی" کے بعد "زعفران زار سلیمانی" لکھ رہے تھے کہ ۱۹۰۱ء میں اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ بالآخر اس داستان کی تکمیل شیخ تصدق حسین کے ہاتھوں سے ہوئی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ قمر کی اور داستانوں کا تو ذکر آتا رہتا ہے مگر "طلسم نارنج" کے متعلق کم واقفیت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" جو انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) سے شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر بڑی قابل قدر کتاب ہے مگر اس میں بھی "طلسم ہوش ربا" اور قمر کی بقیہ داستانوں کا تو ذکر ملتا ہے لیکن "طلسم نارنج" کا کوئی ذکر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر گیان چند کی نظر سے نہیں گذری ورنہ قمر کی دوسری داستانوں کے ساتھ اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ضرور کیا جاتا۔ یہ کتاب قمر نے "طلسم نوخیز جمشیدی" سے پہلے لکھی تھی اور ان کی زندگی ہی میں ۱۹۰۱ء میں نولکشور پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ یہ ان کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی مختصر ضخامت میں مضمر ہے۔ جو نقائص اور محاسن قمر کی طویل داستانوں میں موجود ہیں وہی اس میں بھی ہیں لیکن اس کا اختصار مصنف کے زور قلم کی سب سے بڑی خوبی ہے کیونکہ قمر کی لکھی ہوئی اور بھی جلدیں ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ طلسم نارنج دو سو آٹھ صفحوں کی مختصر سی داستان ہے اور "داستان امیر حمزہ" کے پہلے دفتر "نوشیرواں نامہ" کی دراصل ایک کڑی ہے۔ اس اختصار کے علاوہ داستان

میں کوئی اور امتیازی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ایک فرسودہ اور پامال سطح ہے جس کو آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اچھی داستان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا ماحول تھوڑا بہت بدل جائے تاکہ زیادہ یکسانیت پیدا نہ ہو۔ رزم بزم سحر و جادو اور منظر طلسمات کا رنگ نیا ہو۔ مگر قمر نے "طلسم نارنج" میں اس اہم حقیقت کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "طلسم نارنج" اور داستانوں کی ایک نقل بن کر رہ گئی ہے۔

"طلسم نارنج" میں پلاٹ کو بری طرح الجھا دیا گیا ہے۔ کردار نگاری بہت دھندلی اور غیر واضح ہے۔ ایک مقابلۃً مختصر سی داستان میں واقعات کی اس طرح تکرار ہے کہ حسن داستان میں ذرہ بھر بھی اضافہ نہیں ہو پاتا۔ ساحروں کے سحر بہت عام اور لچر ہیں۔

"طلسم نارنج" کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر حمزہ کی غیر موجودگی میں ملک یونان میں ان کا لڑکا عمرو بن حمزہ یونانی پیدا ہوتا ہے۔ سات برس ہی کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دینا شروع کر دیتا ہے۔ پہلوانوں سے جنگ آزمائی کرتے کرتے ایک مرتبہ ساحروں سے الجھ جاتا ہے اور طلسم نارنج کی ملکہ نارنج جادو سے مقابلہ پڑتا ہے۔ آخر خواجہ عمرو مکہ سے مدد کے لئے آتے ہیں آخر میں فتح عمرو کی ہی ہوتی ہے۔ داستان کے ہیرو عمرو بن حمزہ ہی ہیں اور یہی کردار ہے جو کچھ ابھر سکا ہے۔

اب اس داستان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"عمرو بن حمزہ درخت پر چھپ کر بیٹھے کہ یکایک ایک دریا میں تہلکا پڑا اور مرکب دریائی نکلا۔ چاہا چرنے کو جاؤں کہ عمرو بن حمزہ درخت سے کود پڑے اور اس کی پشت پر جمے۔ وہ مرکب سواری

سے آگاہ نہ تھا۔ بھاگا عمرو بن حمزہ نے گھونسے مارنا شروع کیے۔ گھوڑے
کی کاکلیں پکڑے اپنے کو اس کی پشت پر جمائے ہوئے ہیں۔ مرکب
سارے صحرا میں دوڑتا پھرتا ہے مگر شہزادے نے اس قدر گھونسے
مارے کہ مرکب عاجز ہو گیا ایک نخل کے نیچے آکر ٹھہرا۔ فرخ نے
فوراً زنجیر پاؤں میں گھوڑے کے ڈال دی۔ گھوڑا شیہے بھر رہا ہے۔
لاتیں مارتا ہے مگر فرخ نے اگاڑی پچھاڑی بھی باندھی شاہزادہ پشت
پر سے اتر آیا بعد تھوڑی دیر کے جو سامنے گیا۔ صورت شاہزادے
کی دیکھ کر مرکب کانپنے لگا۔ عمرو بن حمزہ نے چمکارا اور قریب گئے
مرکب نے تھوتھنی اپنی سینے پر شاہزادے کے رکھ دی زبان سے
سینہ چاٹنے لگا۔ عمرو بن حمزہ نے گھوڑے کو گلے سے لگایا اور
زین اس پر کس کر سوار ہوئے"[1]

"عمرو بن حمزہ نے اقرار کیا اور باہر نکل کر لشکریوں کو حکم دیا کہ سویرے
سب تیار رہیں۔ ہم ہمراہ لئے شکار چلیں گے۔ اس شب کو شہزادہ
کو خوشی میں نیند نہیں آئی۔ دو گھڑی رات رہے سے اٹھے
ہتھیار جسم پر آراستہ کیے۔ باہر نکل کر اسی مرکب پر سوار ہوئے۔
سب کو ساتھ لے کر ہمراہ لئے شکار چلے۔ فریدوں شاہ نے چند
بوڑھے آدمی ساتھ کر دئے اور کہا شاہزادے کا خیال رکھنا
لیکن عمرو بن حمزہ جو صحرا میں آئے پہلے نماز پڑھی پہلے قراول جو ہمراہ
تھے انھوں نے باز بہری چھوڑے شکار ہونے لگا۔ شاہزادہ بہت

---

[1] طلسم نادر نخ صفحہ ۱۱

خوش ہوا اور فرخ بن عمرو شکار اٹھا اٹھا کر آرابوں پر لادتا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں شاہزادے نے آرائے معمول کر دیئے فرخ سے فرمایا اے فرخ پرند کا شکار بہت کیا مگر کوئی آہو سامنے نہیں آیا۔۔۔۔۔ چند گنوار دوڑے ہوئے آئے عرض کی کہ سامنے دھالوں کے کھیت میں سو آہو چرا کر رہے ہیں۔ شاہزادے نے گھوڑا بڑھا دیا قریب آکر دیکھا کہ کئی سے مادہ آہو ہیں اور زیج ہیں ایک نر ہے کہ سب پر مستیاں کر رہا ہے۔ شہزادے نے کہا یاد رو ایک خیال رہے کہ اور سب آہوؤں کا تم کو اختیار ہے مگر بیچ میں جو ہرن ہے اس کو ہم شکار کریں گے۔" سلہ

شکار کا منظر نہایت دلچسپ ہے۔ شاہزادے کی بے تابی قابل توجہ ہے۔

مرکب دریائی پانی کا جانور ہے۔ خشکی کی فضا اس کے لئے سازگار نہیں ہو سکتی الف لیلہ ولیلہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ غالباً قمر نے یہ خیالی وہیں سے لیا ہوگا۔

"طلسم نادریج" میں داستان گو جغرافیہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ یونان اور خوارزم دونوں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے شہزادے ایک ہی جنگل میں شکار کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اس داستان میں "الف لیلہ ولیلہ" کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ منشی احمد حسین قمر کے الفاظ میں یہ ہو سکتی ہے کہ

"بابو جے نرائن صاحب مدد مہتمم اخبار نے اس حقیر کو طلب فرمایا اور منظور ہوا کہ "الف لیلا لیلہ" تحریر ہو پھر تجویز یہ ہوا کہ طلسم نادریج"

سلہ طلسم نادریج صفحہ ۱۲

تحریر کیا جاوے۔ حقیر نے قلم اٹھایا اور مصروف تحریر ہوا۔"

اب طلسم تاریخ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے یہ معلوم ہوگا کہ الف لیلہ اس پر کہاں تک اثر انداز ہوئی ہے۔

"...... دیکھا قلعہ میں سناٹا پڑا ہے۔ پھاٹک کھلا ہے۔ کوئی اندر بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بسم اللہ کہکر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کا عجب حال دیکھا کہ جو جس مقام پہ ہے پتھر کا بنا ہوا کھڑا ہے یا بیٹھا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ کنجڑے زیر دوکان جو بہ تکلف بیٹھے تھے ترکاری ترازو میں رکھکر اٹھائی تھی گاہک نے ہاتھ بڑھایا کہ لوں اسی طرح پتھر کے ہوکر دونوں رہ گئے ہیں جا بجا یہی حال ہے عمرو سارے شہر میں پھرا سب کا یہی حال دیکھا..... مکانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ہر شخص ایک ہی بلا میں مبتلا ہے خواجہ سمجھے کہ اس شہر پر کسی نے سحر کیا ہے۔ بیرون قلعہ آئے ایک کاہ فروش ملا۔ اس سے سب حال دریافت ہوا کہ اس طرح پر شاہزادے نے آکر سنگل کو مارا تاریخ جادو ان کو قید کر کے لے گئی ہے خواجہ گھبرائے۔ جی میں کہتے ہیں شاہزادے پر بڑی مصیبت پڑی۔ خدا اس کو مظفر و منصور کرے۔" [۱]

خواجہ عمرو نے غار سے نکلنے کے بعد جو منظر دیکھا اس کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس کا ایک ایک حرف سننے کے قابل ہے۔

"خواجہ غار سے نکلے کنارے کنارے کوہ کے چلے قریب ایک باغ

---

[۱] طلسم تاریخ ص ۵۴

کے پہنچے۔ اندر سے اس کے گانے کی آواز آئی ...... دیکھا مسند بچھی ہے اور وہی ... بیٹھی ہیں، کنیزیں جو نذر چڑھتی ہیں اس کو تقسیم کر رہی ہیں۔ خواجہ سمجھ گئے یہی طلسم کی مالک ہے۔ اس کی صورت بن کر سب کو مار لوں۔ یہ سوچ کر دیوار سے اتر ے ایک گوشے میں چھپ رہے اور مال لینے کے اس بندہ یا نے خول اتارا ایک جادوگرنی تھی کہ سر جھاڑ منہ پھاڑ ... شراب کے نشے میں اٹھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی پلنگ کے آئی۔ آکر پلنگ پر لیٹی۔ خواجہ نے سوتے میں اسے بیہوش کیا اور گود میں اٹھا کر ایک گوشے میں لائے اس کو زندہ درگور کیا۔ اس کی شکل بن کر پلنگ پر لیٹے ...... خوب آرام سے سوئے، صبح کو اٹھے بدمزاج نے جھلا کر کنیزوں سے کہا یہ بتاؤ ہم اسی مقام پر جائیں گے جہاں وہ گنبد ہے، کنیزوں نے کہا یہ کھال پہن لیجئے، زیر پلنگ، آپ کے نقیب ہے گنبد میں جا کر نکلے گا۔"

داستان میں میلے کا منظر اچھا پیش کیا گیا ہے۔ داستان کو مختصر رکھنے کی غرض سے منظر بھی مختصر ہے اور اسی اختصار کی وجہ سے منظر نہایت دلچسپ اور موثر ہے۔ زبان بھی سلیس اور آسان ہے۔ میلے کے بازاروں میں مختلف چیزوں کی دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ حلوائی اپنی اپنی دوکانوں پر بیٹھے ہوئے پوریاں پکا رہے ہیں۔ اسی طرح صراف و بزازہ اور جوہری بڑے ٹھاٹ باٹ سے اپنی اپنی دوکانیں سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ غرض میلے کا منظر مختصر سی کتاب میں بے حد دلچسپ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"بازاروں میں ہنگامۂ بخشش و تماشا گرم ہے۔ کسی مقام پر فرش بچھا کر

وہاں چند رئیس بیٹھے ہیں تماشا میلے کا دیکھ رہے ہیں۔ ایک مقام پر بھٹی شراب کی ہے۔ مینوار چھپیں۔ لاؤ لاؤ کی صدائیں بلند ہے۔ کوئی جھوم رہا ہے۔ کوئی باتیں بنا رہا ہے، کوئی پکارتا ہے کہ اور شراب لاؤ پی پی کر مست ہو رہے ہیں۔ ایک طرف تخت پر ساقنیں بیٹھی ہیں۔ لباس بھاری پہنے ہوئے، حقے سنہری سامنے رکھے ہیں۔ نیچے اوپر سرخ ہیں، ایک طرف آگ روشن ہے۔ جو کوئی جوان آیا اس نے کچھ پھینکا اور آواز دی، بی ساقن صاحبہ ہیڑ دکا لڑہ پلا تا کہ مست ہو جائیں۔ ساقن نے مٹوا کر سے نکالا اور منہ رکھکر آگ رکھوا دی۔ پکار کر کہا لیجے، جوان نے آواز دی ذرا منہ لونگا دو۔ ساقن نے ایک دم لگایا اور حقہ اس جوان کو دیا۔ اس بازار میں بھنگڑیوں کا عجیب ہنگامہ ہے۔ کسی طرف ٹھٹیاں، بھگنیں ناچتی پھرتی ہیں۔ کسی جوان کو جو دیکھا دامن اس کا پکڑ لیا اور گانے لگیں۔ جوان نے چونی نکال کر دے دی۔ وہ آگے بڑھ گئیں۔ سارے میلے میں یہ رخ لگا ہی ہیں۔ حلوائیوں کی دوکانوں پر ہنگامہ ہے۔ پوریاں لگا رہے ہیں۔ کھانے والے لے رہے ہیں۔ صرافہ و بزازہ و جوہری بازار بڑے تکلف سے آراستہ، جوہری بچے دوکانوں پر بیٹھے ہیں۔ کان میں سونے کے بالے پہنے ہیں۔ ان میں امرد اید سے بہا بچہ سے ہیں۔ دھوتیاں باندھے بھاری انگر کھے پہنے ہوئے گارہ دلال حاضر ہیں۔ گاہک کو راضی کر رہے ہیں۔“ ؎۱

یہ منظر بھی نہایت دلچسپ ہے۔ ناچ رنگ کی محفل میں شاہزادہ ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ اس کو کچھ خبر نہیں رہتی۔ نازنین شاہزادے سے لوح حاصل

؎۱ طلسم تاریخ ص ۸۱

کرنے کے لیے کیسی کیسی خوشامد کرتی ہے۔ بالآخر شاہزادہ اس کے قریب ہی آجاتا ہے اور لوح اتار کر اس کو دیدیتا ہے۔ لوح قبضے میں پہنچتے ہی نازنین کے تیور بدل جاتے ہیں اور وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ نازنین نے جان بوجھ کر شاہزادے سے لوح حاصل کرنے کے لئے پہلے سے تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ملاحظہ ہو۔

" شاہزادے نے دیکھا کہ ناچنے اور گانے سے اس نازنین کے زمین کو گردش ہے اور سر بھی پھر رہا ہے چاہا لوح دیکھوں۔ لوح پر نگاہ نہ پڑی کہ وہ نازنین تیار ہوئی سامنے آئی اور شاہزادے کا دامن تھام لیا۔ اس طرح بتایا کہ شاہزادہ خاموش بیٹھا ہے ہر چند چاہتا ہے کہ لوح پر نگاہ ڈالوں مگر بسبب گردش نگاہ نہیں قائم ہوتی۔ اس نازنین نے ہاتھ بڑھایا اور لوح طلب کی اور مسکرا کر کہا کہ آپ اپنے زمانے کے حاتم ہیں۔ مگر یہ تختیاں تو مجھے دیدیجئے۔ شاہزادہ تو ایسا مبہوت تھا کہ بلاتکلف لوح بھی اتار کر دے دیں۔ بس اس نازنین نے ایک قہقہہ مارا اور آواز دی کہ کیوں اے طلسم کشا اسی منہ پر دعوی طلسم کشائی کیا ہے۔ سب اہل محفل تو اٹھ کر بھاگ گئے اور وہ نازنین گرفتار کر کے شاہزادے کو گنبد میں لائی تختیاں لوح کی تخت پر رکھدیں۔ شاہزادے پر غصہ کر رہی ہے اور کہتی ہے۔ منم رفاقہ جادو اے عمرو بن حمزہ اس بدعت سے قتل کروں گی۔ کہ ماہیان دریا و مرغان ہوا اگہاد سے حال پر کریہ و زاری کریں اور مجھ کو ترس نہ آئے۔ میں جانتی تھی کہ آپ میرے مرنے پر آدیں گے سب سامان تیار کر رکھا تھا۔" [۱]

---

[۱] طلسم نارنج ص ۱۰۵

تخیل کی بلند پروازی کا ایک عمدہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"تھوڑی دور راستہ طے کر کے طرف آسمان کے سر اٹھا یا دیکھا سات ستارے آسمان پر چمک رہے ہیں۔ شہزادہ انھیں کے نشان پر چلا۔ ان ساتوں ستاروں میں اس قدر روشنی ہے کہ تمام صحرا روشن ہو رہا ہے۔ شاہزادہ انھیں ستاروں کی روشنی میں روانہ ہوا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ وہ ساتوں ستارے آسمان سے اترے ایک باغ تھا اس میں جا کر غائب ہوئے۔ شاہزادہ اس باغ کے اندر آیا دیکھا باغ نہایت شگفتہ پھولوں کے جا بجا انبار طائران زمزمہ سرا کی پکار شاہزادہ تماشئے گل و غنچہ کرتا ہوا ایک مقام پر پہنچا دیکھا ایک قبر بنی ہے۔ اس پر ایک پتھر نصب ہے۔ اس پتھر میں لکھا ہے کہ ایں قبر کشتۂ حسرت دیاس ملکہ گلشن نارنجی پوش شاہزادے کا قبر کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ گلشن کو یاد کر کے فاتحہ پڑھی اور بے قرار ہو کر رونے لگا۔ سامنے حجرا بند تھا۔ دروازہ اس کا کھلا چند کنیزیں مشابہ بصورت کنیزان گلشن حجرے سے نکلیں اور شاہزادے کو دیکھ کر تسکین دینے لگیں۔ ایک کنیز نے کہا میں پانی لاؤں منہ ہاتھ دھو ڈالیے۔ یہ کہہ کر وہ کنیز گئی۔ جا کر ایک طشت لے آئی۔ شاہزادے کے ہاتھ دھلائے"[1]

مغلوں کے زمانے میں ستی کی رسم کا رواج تھا مگر جلا دینے کی سزا کا رواج نہ تھا۔ پتہ نہیں ہندوستان میں جلا دینے کی سزا کا کبھی مغل خاندان کے بعد رواج رہا ہو۔ ستی کی رسم ضرور تھی مگر ستی اور جرم میں بڑا فرق ہے۔ خدا معلوم یہ خیال داستان گو کے دل میں کیسے آیا۔ مدہر بانو نے جلا دینے کی سزا کا اشتہار بھی دیا ہے

---

[1] طلسم نارنجی - ص ۱۰۷

ملاحظہ ہو۔

"زور بانہ نے کہا اس کو کوٹھری میں بند کرو اور بیرون قلعہ حکم دے دو کہ لکڑیاں کاٹ کر انبار کریں۔ میں کل صبح کو اس کو جلا دوں گی اور اشتہار چھپاں کرادو کہ گلشن کو کل سزا ملے گی۔ دیکھنے والے آئیں۔ بیرون قلعہ جمع ہوں۔ یہ کہکر زور بانہ تو چلی گئی زلزلہ جادو نے بیٹی کو کوٹھری میں بند کیا چند کنیزیں مقرر کیں کہ اس بدنصیب کو سمجھاؤ کہ راہ پر آئے ورنہ کل باعث خرابی ہوگا۔ ہم لوگ اس کے چھوٹے ہیں اس کے حکم میں کون دخل دے گا جو چاہے سو کرے"[1]

اس داستان میں قمر بعض جگہ پرانی روش سے ہٹ گئے ہیں۔ شاہزادہ عمرو بن حمزہ بے ایمانی سے آدمیوں کی مدد لے کر ایک ساحرہ کو قتل کرتا ہے۔ عموماً شاہزادے اتنی ہوشیاری کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ اس قدر خود سر اور ضدی ہوتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی کسی دوسرے کی مدد کو گوارا نہیں کرتے۔ یہاں شاہزادے نے دس دس کی مدد سے ساحر کو کتنا تڑپا تڑپا کر قتل کیا ہے۔ ایک ساحرہ کے قتل کے لئے شاہزادے کو تیس آدمیوں کی مدد لینا پڑی۔ یہ شاہزادے کی عیاری کا بہترین ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ہر چند سمجھایا مگر شاہزادے نے نہ مانا اور اکھاڑے میں پھاند پڑا۔ اللہ تو خونخوار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور منع کر رہی ہے کہ اے شخص برائے خداوند اکھاڑے سے نکل جا۔۔ شاہزادے نے پکار کر آواز دی اے ملکہ عالم اس پہلوان کی قضا درپیش ہے آج اس کو قتل کر ڈالوں گا جیسے ہی پہلوان لپٹا شاہزادے نے پکار کر کہا اے دس والو اور دس جوان آستینیں چڑھا کر ٹوٹ پڑے

---

[1] طلسم نادر نخ ص ۳۷

اور دسوں نے منھ پہلوان کا دبایا کہ پہلوان کی زبان منھ سے باہر نکل آئی... شاہزادے نے پکار کر آواز دی کہ بھائی ہاتھ والو آؤ دس جوان اور کود پڑے ہاتھوں کے پہلوان کے پکڑ کر مروڑنے لگے پھر شاہزادہ عمرو بن حمزہ یونانی نے پکارا کہ بھائی پاؤں والو آؤ دس جوان وہ بھی کود پڑے پہلوان کی ٹانگیں پکڑ لیں۔"[1]

جس زمانے میں یہ داستان وجود میں آئی وہ ایک ایسا جنگ جو قوم کے ادبار کا زمانہ تھا۔ امرا اور عوام دونوں شمشیر زنی کو بھول چکے تھے اور دادِ عشرت دینے میں مشغول تھے۔ کبھی جنگ کا موقع پڑ جاتا تھا تو اپنے آپ کو کشت خون سے علیحدہ رکھنے یا بزدلی کا مظاہرہ کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان داستانوں میں لڑائیوں اور جنگوں میں وہ صداقت بیان نہیں پائی جاتی جو بزدلوں کا نقشہ کھینچنے میں بدرجہ اتم موجود ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ خیال آرائی میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو کسی سچی چیز کو دہرانے میں مل سکتی ہے۔ داستان گو کو چونکہ اس قسم کے واقعات سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ اس لیے وہ حقیقت کو زیادہ خوبی سے بیان کر سکا ہے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

"وہ لوگ جو سدا رشی تھے انھوں نے جو سنا کہ صبح کو معرکہ آرائی ہے اور ساحروں سے لڑائی ہے۔ ان کا اس خبر سے یہ حال بہم پہنچا کہ لحظہ بلحظہ میٹھا میٹھا درد پیٹ میں شروع ہوا۔ دم بدم پاخانے جانے لگے۔ ساتھ والوں سے کہہ رہے ہیں کہ سدھیا لیکھو۔ یہ نوکری کی ملک الموت کا سامنا ہے۔ جان بچا کر نکل چلو اگر ان کی فتح ہوئی تو پلٹ آئیں گے اگر کوئی پوچھے گا کہ تم لوگ کہاں تھے۔ ہم کہدیں گے کہ میدان جنگ میں

---

[1] طلسم ہوشربا ج ۵ ص ۹۰

تھے۔ تقدیر نانی بچ گئے۔ دیکھئے اس سبب کیا خلعت ملتا ہے اور اگر
شکست ہوئی تو خلق خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست سپاہی کے
لڑکے ہیں اور جگہ مانگ کھائیں گے۔ کسی نے کہا میری حالت نہایت علیل ہے
بعض درد کمر کہہ رہے ہیں کہ ہم تو اپنے زعم میں مرے ہوئے ہیں۔ ہم نے
اپنے ہمزاد کو دیکھا تھا کہ اس کے دھڑ پر سر نہیں ہے بعض سوتے سوتے
بیچخیں مار کر رونے لگے۔ کسی نے پوچھا بھائی خیر تو ہے۔ جواب دیا۔ کہ
نانی اماں کو ابھی روتے ہوئے دیکھا۔ بعضے سوتے سوتے ہائے وائے
کرنے لگے کسی نے پوچھا کہ کیا ہوا کہا ہم نے ابھی خواب دیکھا کہ چہار
طرف گھرے ہوئے ہیں۔ کہیں بھاگنے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ کہا اور چلا کر اپنے
چاکروں کو بلایا۔ کہا جلد گھوڑے پر زین کھینچو۔ اس نے کہا خداوند
مجھ کو لڑائی ہے۔ یہ وقت سوار ہونے کا نہیں ہے۔ بدنام ہو جائیے گا
۔ اس کو جھڑکا کر جواب دیا تمہارا مطلب ہم سمجھے۔ تم چاہتے ہو کہ ہم
مارے جائیں۔ تم ہمارا مال لے کر مزے اڑاؤ۔ ہم تمہاری خوشی نہ کریں گے
۔ ابھی بھاگے جاتے ہیں۔ یہ کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ
ہو گئے۔ بعضے بدحواس پھر رہے ہیں۔ اتفاقاً طلائے کے جو لوگ
آئے سواروں کو دیکھا اور بیچ شاخ روشن دیکھے۔ غل مچانے
لگے کہ یارو ہوشیار ہو جاؤ کہ دشمن نے شب خون کیا ہے پھر کسی نے یہ
تحقیق نہ کی کہ شب خون کدھر آیا۔ یہ کہتے ہوئے نکل گئے۔ گھبرا کر مرزا روں
لینا لینا جاتے نہ پائے کہکر اٹھے ادھر چلے گئے۔ دم بھر میں سارا لشکر
خالی ہو گیا۔ شاہزادہ اٹھ کر باہر آیا دیکھا لشکر میں ہلچل ہے۔ لوگ
بھاگے جاتے ہیں۔ یکایک ستارہ سحری آسمان پر چمکا۔۔۔۔۔۔"

"کہا دیکھو صاحبو، اس شبیر نے پیمانہ چھوڑا۔ یہاں آکر شب خون
مارا۔ دیکھیں تقدیر کیا دکھائے۔ چند کمسن غلغلہ کرتے ہوئے بھاگے
جس طرف خیمے جل کر گر رہے تھے کچھ لوگ اس طرف سے بھاگے
بعضے پڑے ہوئے سو رہے تھے۔ آواز جو شاہزادے کی کان میں
پہنچی گھبرا کے اٹھے۔ جامے کے بدلے زیرہ جامہ کھینچا مگر گٹھنا ہاتھ میں آیا۔
مہریوں نے ہاتھ ڈال دئے۔ بعضے لڑے بھڑے ہتھیار لگا کر اٹھے باہر
آکر گھوڑا اتیار کیا۔ ہر مقام پہ جنگ دیدہ و کار آزمودہ تھے۔ گھوڑے پر
سوار ہوئے مگر منہ طرف دم کے کیا اور پشت طرف منہ کے گھوڑے
کو کوڑا مارا۔ گھوڑا طرارہ بھر کے چلا۔ ایک نے پکار کر کہا بھائی کہاں
جاتے ہو جواب دیا کہ بھائی ہم بھاگے جاتے ہیں۔ چاہتے تھے کہ طرف
مشرق کے جائیں گھوڑا طرف مغرب کے چلا۔ گھوڑے کو پیٹ
رہے ہیں۔ ادھر سے نقاب دار لڑتا بھڑتا آتا تھا۔ اس کے ساتھ
والوں نے مارے تلواروں کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اس طرح ہزاروں
قتل ہوئے۔ بھاگے چلے جاتے تھے۔ نقاب دار لڑتا بھڑتا نکل گیا
مگر قیس بارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جا کر ملازموں نے خبر دی۔ قیس اپنے مقام
سے اٹھا۔ باہر آکے دیکھا جابجا تلوار چل رہی ہے۔ بھاگنے والے بھاگے
جاتے ہیں۔ تو تیم کر لڑنے والے تھے انھوں نے روکا وہ آکر لڑنے لگے
قیس نے آکر منع کیا کہ آپس میں لڑ رہے ہو لہذا الگ ہو مگر جابجا تلوار
چل رہی ہے۔ قیس جو منع کرتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ دشمن سامنے
آگئے کیونکر جنگ نہ کریں۔ بھائی نے بھائی کو مارا۔ باپ نے بیٹے کو

قتل کیا۔ قیس جا بجا پھر رہا ہے۔ ہر چند آپس سے الگ کر تلے ہے مگر وہ تر
جاتے ہیں۔ غرض کہ رات بھر تلوار چلی۔ صبح کو قیس بارگاہ میں بیٹھا کہ کمیدان
صاحب آئے کہا حضور پلٹن خوب لڑی۔ چاندنی جو آئی سر بھرے پال دار
سامنے بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا یہ تو ہمارے رسالے کے سر ہیں۔
کمیدان نے گھبرا کر کہا مسلمانوں نے ایسا بے دست و پا کیا تھا کہ جو سامنے
آیا اس کو قتل کیا۔ رسالدار نے کہا کہ ہمارا رسالہ خوب لڑا اور
صدہا سر کاٹے ہیں۔ ہمارے سواروں نے خورجیوں میں بھرے ہیں۔ ہاں
یار و سب کو بلاؤ۔ سوار خورجیاں لے کر آئے وہ جو سر اونڈیلے کمیدان
نے سر پیٹ لیا اور کہا رسالدار صاحب یہ تو سب سر ہماری
پلٹن والوں کے ہیں۔ ...... کنیز نے آ کر ملکہ لیلا کو خبر کی کہ اس طرح
لشکر میں ہنگامہ ہے اور لوگ یہی کہتے ہیں کہ کئی لاکھ آدمی شب خون
آئے تھے ...... قیس لشکر میں آیا جا بجا دیکھا تلوار چل رہی ہے
اور گوشت خر دنداں سگ ہو رہا ہے آپس ہی والوں کو قتل
کر رہے ہیں۔ قیس کے ساتھ دشمنی تھی۔ سب کو الگ کیا خیمہ
کی آگ بجھوائی مگر خبر سنی کہ آج بازار غلہ فروشاں کو مسلمانوں نے
بہت تباہ کیا اور بہت سا غلہ لے گئے۔ پر کاروں نے عرض کی غلہ
بہت جلا دیا اور دکانداروں کو مارا ایک دوکاندار کے ہاتھ میں چاندی کے کڑے تھے
ایک جو لیتے بیکا ہاتھ کاٹ لیا وہ دوکاندار ہاتھ تھام کر رہا تو سوار نے تلوار دی کہ
دوسرا ہاتھ بھی کٹ دیتا جا۔ وہ جا کے آگ ... نظر آ کر اس سے لڑنے
چھاؤنی چھوڑا۔ نیزہ ڈال کر کڑا نکال لیا وہ جھکتے کے جہاں زیادہ دیکھے
فتیلہ بارود ڈال دیا غلہ جل کر خاک ہوا۔ تمام بازار غلہ فروشاں

صاف پڑا ہے آج یک دانہ نہیں بچا۔ قیس نے کہا لشکر کی خوراک کیا ہوگی۔ سپاہیوں نے کہا حضور دیہات سامنے ہیں۔ ابھی جا کر غلّہ لاتے ہیں۔ سپاہی اور سوار دیہات میں گئے۔ کاشتکاروں کے گھر سے غلّہ اٹھا لائے زمیندار نے آ کے قیس سے فریاد کی کہ قیمت غلّہ کی دلوائیے۔ قیس نے جواب دیا کہ ہم کو لیسر حمزہ نے لوٹا ہم نے تم سے غلّہ لیا۔ اب جا کر بیٹھو ورنہ گاؤں پھنکوا دیں گے۔ وہ لوگ بددعائیں دیتے ہوئے اپنے اپنے مقام پر چلے گئے مگر گالیاں دیتے تھے کہ ایسے نالایقوں سے سامنا نہ پڑے۔ سلہ

دیکھا نقش واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم ناممکن کہہ سکیں۔ یہ دونوں مناظر محبوب ابتری کا عالم پیش کرتے ہیں۔ جیسے کوئی محمد شاہ رنگیلا کسی نادر شاہ کے مقابلہ پر نکلا ہو۔ خوبی یہ ہے کہ قصے عرب و یونان کے ہوتے لیکن ان کی عقبی زمین تمام تر ہندوستانی رہتی ہے۔ چاندی کے کڑے۔ زمیندار۔ کمیدان۔ نواب دارد سال دلدار۔ جاگیر دغیرہ قطعی ہندوستانی ہے۔ داستانوں کو یہ الزام دیا کہ ان میں قصے یونان و مصر کے ہوتے ہیں۔ بے کار ہے۔ قصے کسی جگہ کے بھی ہوتے ہوں لیکن ان میں رنگ ہندوستانی رہتا ہے۔ نام بدل گئے تو کیا۔

سلہ طلسم نارنج ص ۹۲، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۵۷

طلسم ہفت پیکر

منشی احمد حسین قمر لکھنوی بڑے زندہ دل اور باغ و بہار انسان تھے۔ داستان گوئی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے اس فن کو نہ صرف ترقی دی بلکہ اس کے ذریعہ نت نئے پھول کھلائے۔ بڑی بڑی ضخیم داستانیں لکھیں جو اردو ادب میں ایک گوناگوں خصوصیت کی حامل ہیں۔ طلسم ہفت پیکر بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ ان کی آخری تصنیف طلسم زعفران زار سلیمانی ہے جو ان کے مرنے کے بعد شیخ تصدق حسین نے مکمل کی۔ اس لیے "زعفران زار سلیمانی" قمر اور تصدق حسین دونوں کا کارنامہ ہے۔ شیخ صاحب نے بھی کئی داستانیں تصنیف کیں۔ لیکن داستان گوئی کا سلسلہ قمر کے بعد زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ ان کی آخری تصنیف "گلستان باختر" کی تیسری جلد ہے۔ یہ جلد ۱۹۰۵ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس داستان کے بعد کسی دوسری داستان کی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں داستان نویسی کی آخری تاریخ ۱۹۰۵ء ہے گویا اردو میں ایک سو چار برس کے لگ بھگ داستان گوئی کا کام جاری رہا۔ اس طویل مدت نے اردو ادب کو ایک ایسا مواد فراہم کر دیا جو کسی زبان میں اتنی دلکشی اور دلچسپی کے علاوہ اتنی تفصیل سے نہیں مل سکتا۔

ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی اور وقار عظیم صاحب کی کتاب "ہماری داستانیں" مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لاہور بڑی قابل قدر اور معلومات افزا ہیں۔ ان دونوں حضرات نے داستان امیر حمزہ کی دوسری کڑی[1]

---

[1] داستان امیر حمزہ کی پہلی کڑی کا تعلق فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں اشک کی داستان سے ہے جو داستان کے سے ... اس کا چار حصوں میں ترجمہ کر کے ایک جلد میں چھاپ کیا تھا۔ داستان امیر حمزہ کی دوسری کڑی سے مراد وہ ۴۷ جلدیں ہیں جو نولکشور پریس لکھنؤ کے یہاں تمام مرتب ہوئیں۔

کی تعداد ۴۶ بتائی ہے جبکہ یہ تعداد ۴۶ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی تفصیل اس طرح سے:

نوشیرواں نامہ	دو جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
ہرمز نامہ	ایک جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
[illegible] نامہ	ایک جلد	تصنیف احمد حسین قمر
کوچک باختر	ایک جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
بالا باختر	ایک جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
ایرج نامہ	دو جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
طلسم ہوش ربا	۴ جلدیں (ابتدائی)	ترجمہ محمد حسین جاہ
طلسم ہوش ربا	۴ جلدیں (آخری)	ترجمہ احمد حسین قمر
لعل نامہ	ایک جلد	ترجمہ سید اسمعیل اثر
تورج نامہ	۲ جلد	ترجمہ پیارے مرزا، تصدق حسین، اسمعیل اثر
صندلی نامہ	۲ جلد	ترجمہ شیخ تصدق حسین
آفتاب شجاعت	۵ جلد	تصنیف شیخ تصدق حسین
گلستان باختر	۳ جلد	" "
بقیہ طلسم ہوش ربا	۲ جلد	" احمد حسین قمر
طلسم نور افشاں	۳ جلد	" " " "
طلسم ہفت پیکر	۳ جلد	تصنیف احمد حسین قمر
طلسم خیال سکندری	۳ جلد	" " " "
طلسم نوخیز جمشیدی	۳ جلد	" " " "
طلسم زعفران زار سلیمانی	۲ جلد	تصنیف احمد حسین قمر و شیخ تصدق حسین
طلسم نارنج	۱ جلد	تصنیف احمد حسین قمر

دونوں کتابوں میں "طلسم نارنج" مصنفہ احمد حسین قمر کا ذکر نہیں ملتا غالباً یہ کتاب دونوں کی نظر سے نہیں گزری۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ داستان ۸۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اب اس داستان امیر حمزہ کی دوسری کڑی کی تعداد ۴۶ کے بجائے ۴۷ ہو جاتی ہے۔ یہاں ۴۶ جلدوں کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" سے شکریے کے ساتھ پیش کی گئی ہے، ۴۷ویں جلد کا اضافہ میری طرف سے ہے۔
ان ۴۷ جلدوں میں ۱۰ [illegible]۔

"طلسم ہفت پیکر" کے اختتام پر قمر کی کہی ہوئی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ داستان پہلی مرتبہ ۱۳۱۵ھ میں شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر نسخہ ۱۹۰۹ء کا مطبوعہ ہے۔ آخری سطر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ داستان تین بار شائع ہو چکی ہے۔ نو سال کے مختصر عرصے میں ایک کتاب کا تین بار طبع ہونا اس کی پسندیدگی اور مقبولیت کی دلیل ہے۔

اس داستان کی وجہ تالیف خود قمر نے اس طرح بیان کی ہے۔

"ایک دن یہ حقیر (منشی احمد حسین قمر) بعد ختم کرنے بقیہ طلسم ہوش ربا کے حاضر خدمت فرزند منشی نولکشور صاحب مرحوم سی۔ آئی۔ ای یعنی منشی پراگ نرائن صاحب ہوا۔ بہ عنایت و مرحمت ارشاد فرمایا کہ "طلسم ہفت پیکر" کا اشتہار آپ نے طلسم نور افشاں کے آخر میں دیا ہے۔ فرمائش بھی اس کی آگئی۔ لہٰذا قلم اٹھائیے" اس مختصر سی داستان میں خوبیاں بھی جا بجا نظر آتی ہیں تقریظ منشی اشتیاق حسین جمیل کی ہے۔ یہ قمر کے بیٹے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنے باپ کی خوب تعریفیں کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں

"بڑی تعریف یہ ہے کہ یہ داستان کسی مقام پر سست نہیں ہوئی۔"

یہ داستان تین جلدوں پر مشتمل ہے گویا ۲۸۲۲ صفحوں کا یہ مجموعہ چھ سال کے اندر اندر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان تین جلدوں کا انتخاب کیا جائے تو بمشکل دو سو صفحوں میں آجائے گا بعض نمو

یہ سوچ کر حیرت اور تعجب ہوتا ہے کہ منشی احمد حسین قمر لکھنوی نے "طلسم ہوش ربا" کو اتنی خوبصورتی سے تصنیف کیا۔ وہ اس داستان میں کہیں ابھرتے ہی نہیں۔ "طلسم ہفت پیکر" ایک فرسودہ اور بوسیدہ طلسم ہے۔ اس میں طلسم ہوش ربا کی خوبصورتی ڈھونڈھنا تو بالکل بے کار ہے مگر یہ "طلسم فتنۂ نور افشاں" سے بھی گئی گزری داستانوں کا مجموعہ ہے۔ رستم طلسم کشا کی فتح اسد غازی کی فتح نہیں یہ تو یک پا مکمل فتح ہے۔ جلد اول ہی میں رستم کو زرہ کلاہ و نیفہ ہفت جوہر مل جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدھر دیکھیے رستم ساحروں کو شکستوں پر شکستیں دے رہے ہیں کیونکہ ان تحفہ جات کی وجہ سے ان پر سحر اثر نہیں کرتا۔ اگر کوئی معشوق صفت ساحرہ آتی ہے تو اسیر کمند الفت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جلد اول میں شروع سے آخر تک جوان اور حسن کی پیاسی شاہزادیوں کا ایسا تانتا بندھا ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اس پہلو سے تو رستم کو اطمینان ہے کہ ساحرہ اگر خوب رو نکلتی آتی تو پھر کسی چیز کی فکر نہیں۔ جام شراب ہو، ساحرہ پر شباب ہو پھر کیسی طلسم کشائی اور کہاں کی لڑائی۔ صبح کو جب ساحرہ اٹھ کر روانہ ہوتی ہے تو شراب عشق میں مست، طلسم کشا پہ جان دینے کو تیار۔ غرض یہ کہ "طلسم ہفت پیکر" میں ان عاشق مزاج شاہزادیوں کی وہ بھرمار ہے کہ داستان لچر معلوم ہونے لگتی ہے۔ حد یہ ہے کہ تقریباً تین ہزار صفحوں میں کلائمکس (CLIMAX) جو پیدا ہوتا ہے وہ آخری چالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کلائمکس پیدا کرنے کے لئے قریب تین ہزار صفحوں کو کیوں برباد کیا گیا۔ یہ داستان "طلسم ہوش ربا" کا چربہ تھی مگر بے حد ناقص ہے۔ البتہ جلد اول میں ایک معنی خیز اشاریت ملتی ہے۔ ایک ملکہ ہوش ربائے شیریں کلام (نام پر غور کیجئے) نور الدہر کی معشوق ہے۔ ایک جگہ نور الدہر اپنی معشوقہ سے کہتا ہے کہ

"ہوش ربا نے بڑا کام کیا" ۔ ہوش ربا نے کہا کہ "اب حضور پر بڑی سختیاں پڑیں گی جہاں تک ہو سکے گا میں ہر وقت سامنے پہنچوں گی" ۔ سچ ہے ہوش ربا ہی ہر وقت منشی احمد حسین قمر (حضور) کے سامنے پہنچی ہے اور آڑے وقت میں کام آتی ہے ۔ اسی کی داستانوں کا فیض ہے کہ یہ تین ہزار صفحے بھی مکمل ہو گئے ورنہ "ہفت پیکر" میں کوئی چیز اپنی تو ہے نہیں ۔

یہ قصہ اتنی اچھی طرح شروع ہوا تھا کہ اگر مصنف چاہتا تو اس کو طلسم ہوش ربا سے زیادہ بلند مرتبہ دے سکتا تھا ۔ ہفت پیکر ایک خدا ہے جس کی نگی مثنویہ سات مختلف پہاڑوں پر نصب ہے ۔ ہفت پیکر ایک عجیب خدا ہے ۔ لقا کی طرح وہ بھی ادھر سے ادھر بھاگا بھاگا پھرتا ہے حالانکہ لقا پر اسے اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ ایک بڑا ساحر بھی ہے ۔ چنانچہ طلسم ظاہر برباد ہوتا ہے ۔ ہفت پیکر باغ نسترن میں پناہ لیتا ہے ۔ خداوند کو مومنوں کے پنجوں سے بچانے کے لئے سترہ لاکھ کا عظیم لشکر جمع ہوتا ہے مگر اس کا بھی ایک جنگ مثنویہ میں صفایا ہو جاتا ہے اور آخر میں ہفت پیکر بہ ست طلسم کمشا کمیفر کردار کو پہنچتا ہے ۔ اس قصے کو کتنی اچھی طرح لکھا جا سکتا تھا ۔ ہر کوہ کے ساحروں کا جدا گانہ رنگ سحر و ساحری کے نئے نئے مناظر ان سب کی شکست و ریخت ہفت پیکر کی حماقتیں باغ نسترن پر معرکے اور شعبدہ جات طلسم باطن کیونکہ طلسم باطن روح طلسم ہوتا ہے مگر قمر نے ان سب چیزوں کو نظر انداز کر دیا ۔ ہفت پیکر ایک ایسی ہستی ہے جسے پڑھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے نہ افسوس ہوتا ہے نہ اس کا کوئی رعب ہے نہ کیریکٹر ہے ۔ جلد اول سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو ۔

"عمرو نے دیکھا کہ باغ پر بہار پھول کھلے ہوئے طائر زمزمہ سرائی کر رہے ہیں گلشن غنچہ دہن نقلی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بادہ دری

میں لائی اپنے مقام پر بیٹھی کہا غنچہ دہن آج جو راندار جادو آئیں گے
ان کو تیرا گانا سنوائیں گے۔ ان کو گانے کا بڑا شوق ہے۔ غنچہ دہن
نے گھبرا کر کہا کہ داری میرا مزاج بھی نیا ہوگا میں نہیں سمجھی کہ راندار
جادو کون صاحب ہیں۔ میرے منہ سے اگر کوئی بات خلاف نکلے
غصہ نہ فرمائیے گا۔ میں اگلی سب باتیں بھول گئی اب مجھ کو بالکل
یاد نہیں ہر وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ جمع ہے۔ خداوند ہفت
پیکر بیٹھے ہیں۔ میں ان کے سامنے گا رہی ہوں۔ گلشن نے کہا کہ اے
غنچہ دہن راندار جادو وہ شخص ہے کہ مدت سے مجھ پر عاشق ہے ہر
ہفتہ میں ایک مرتبہ آتا ہے کہ شاید ملکہ قبول کرے۔ میں نے
ابھی تک اس کا کہنا نہیں مانا۔ دو چار دن سے بڑے تردد میں
ہے۔ صاحب قران کو قدرت نے اس کے سپرد کیا ہے۔ دو بیاہ
فرزندان عمرو بھی اسی کی قید میں ہیں۔ دیکھئے آئے یا نہ آئے لیکن
آج اس کے وعدے کی شب ہے۔ یقین تو ہے کہ ضرور آئے
عمرو کی تلاش کرتا ہے۔ امیر کی حفاظت الگ ہے۔ یہ بھی اس کو
حکم ملا ہے کہ عمرو کو گرفتار کر کے لا۔ آج کل بڑے بڑے اس کو
کام ہیں۔ یہ سب حال اس نے رقعے میں لکھے تھے عمرو یہ سن کر خوش
ہو رہا۔ خیال میں گزرا کہ اچھے مقام پہنچے اسی کی تو مجھ کو فکر تھی
وہ آج آئیں گے۔ میں ان کی گردن لوں گا۔ گلشن نے صحن باغ میں
فرش کروا دیا شامیانہ استادہ ہوا باغ میں روشنی کرائی خود مسند پر آ کر
ئی۔ خواجہ مسخرہ پن کر رہے ہیں کبھی گاتے ہیں کبھی صفت ہفت پیکر
کبھی حال قید صاحب قران پوچھتے ہیں۔ گلشن کہتی ہے کہ تلطف فرزندہ

میں قید ہیں۔ تھوڑی رات گزری ہے چاندنی باغ میں پھیلی ہوئی ہے۔
گلشن انتظار میں رازدار کے بیٹھی ہے کہ آسمان پر بجلی چمکی دیکھا خواجہ نے
ایک ساحر تخت پر سوار تاج سر پر تخت اٹھاتا ہوا آیا۔ سب کھڑے ہوگئے
اس جادوگر نے آکر گلشن کا ہاتھ پکڑ لیا بہ خوشامد پوچھا کہ کیوں ملکۂ عالم مزاج
کیسا ہے۔ گلشن نے کہا کہ اے رازدار آج نیا معاملہ درپیش ہے۔ ہماری
کنیز غنچہ دہن نظر کردہ ہوئی۔ قدرت نے اس کو علم موسیقی تعلیم کر دیا۔
ایسا گاتی ہے کہ اس کا مثل نہیں۔ میں تو اس کا گانا سن کر عرصہ دراز
تک رو یا کی۔ ایسا گاتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آٹھ پہر گانا سنئے۔ رازدار
نے کہا کہ ملکہ اس کو بلاؤ گلشن نے کنیزوں سے کہا کہ غنچہ دہن کو بلاؤ کہنا
کہ میاں رازدار آئے ہیں۔ تم کو گانا پڑے گا۔ اے رازدار کیا کہوں
اس کا تو مزاج بدل گیا۔ سب باتیں بھول گئی۔ جب میں بتاتی ہوں
تب اس کی سمجھ میں آتا ہے ۔[1]

داستان کے آغاز میں ہفت پیکر کی عظمت کو اتنی اچھی طرح پیش کیا
گیا تھا کہ اگر وہ رنگ برقرار رکھا جاتا تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ طلسم ہفت پیکر
کی سرزمین جہاں کے ذرے ذرے سے شجر شجر سے یہی صدا آتی ہے کہ خدائی ہفت پیکر
کی برحق اور مسلّم ہے۔ طائر بھی اسی کا غل مچاتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامنوں میں میلے
لگتے ہیں۔ تعویذ گنڈے سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، ہر آرزو پوری ہوتی ہے۔ لشکر اسلام
سے لڑتے ہوئے اگر کسی مخالف پہلوان پر آڑا وقت آتا ہے تو وہ ہفت پیکر کی
دہائی دیتا ہے فوراً سیاہ آندھی اٹھتی ہے یا طبقۂ زمین شق ہو جاتا ہے۔ پہلوان اسلام
غرق ہو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہفت پیکر واقعی ایک بڑا زبردست

---

[1] طلسم ہفت پیکر جلد اول ص ۲۰،۲۱

شعبدہ باز ہے مگر جیسے جیسے داستان آگے بڑھتی ہے ہفت پیکر کی کمزوریاں عیاں ہونے لگتی ہیں۔[1]

"جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا"

ان عیوب کے باوجود اتنی ضخیم داستان میں جا بجا خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جلد اول میں عیوب بہ نسبت دوسری اور تیسری جلد کے زیادہ ہیں پھر بھی جلد اول سے دو ایک نمونے اور جو خوبیوں کے حامل ہیں پیش کئے جاتے ہیں۔ عبارت کس قدر رنگین اور پر اسرار ہے، زبان میں بھی سلاست و روانی حد درجے پائی جاتی ہے ملاحظہ ہو۔

"ایک صحرا میں آکر اترے رات کو دیکھا جنگل میں دو مقام پر آگ روشن ہے پھر وہ دونوں مل گئیں۔ اندر سے اس آگ کے شور و غل کی آواز آتی تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ہزار ہا آدمی لڑ رہے ہیں۔ بدیع الزماں رات بھر دیکھا کئے۔ صبح کو دیکھا ہزار ہا لاشہ اس مقام پر پڑا ہے۔ دریائے خون جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے رات بھر خوب لڑائی ہوئی بدیع الزماں حیران ہوئے کچھ عجیب صورت کے لوگ ہیں۔ کالی کالی صورتیں بڑے بڑے قد، بعضوں کے چار ہاتھ ایک سر کٹ گیا۔ ایک سر جسم پر موجود ہے بدیع الزماں اس عجائب و غرائب کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ سید نے کہا یہ مقام دیو زاد و جنات کا معلوم ہوتا ہے یہاں سے کوچ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ آفت برپا ہو۔ بدیع الزماں نے کہا اس کا دریافت کرنا ضروری ہے۔ شب کو آکر دیکھیں گے۔ سب سردار بھی مانع ہوئے۔ بدیع الزماں نے نہ مانا ..... قریب آگ کے پہنچے پکار کر آواز دی۔ تم کون لوگ ہو جو آپس میں کشت و خون کرتے ہو اپنے کو ظاہر کرو۔

ایک آواز آتی ہے، اے جوان تو کون ہے جو ہم سے دریافت کرتا ہے۔
"تین منزلیں طے کی تھیں کہ صحرا سے گرد اڑی دیکھا ایک نقابدار بادلہ پوش تاج دار ساٹھ ہزار جوانوں سے آگے پہنچا۔ گھوڑے کو مہمیز کیا میدان میں آکر آواز دی۔ تم لوگ کون ہو۔ کس پر لشکر کشی کی۔ کہا طلسم کشا پہ جاتے ہیں۔ نقاب دار نے فوج کو اشارہ کیا۔ فوج تلواریں کھینچ کر ساحران پر آن پڑی۔ نقاب دار کے مقابلے میں برہمن جادو نکلا۔ "[1]

سب سے بڑا عیب اس داستان میں یہ ہے کہ صفحہ ۴۱۲ سے ۵۸۵ تک خسرو شیر دل کے عروج کا جو قصہ ہے وہ بالکل طلسم نارنج بہ عمرو بن حمزہ کی داستان کی نقل ہے یہاں تک کہ قمر نے نام بھی تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔
اس داستان میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ مرکزی داستان پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ دوسری داستانوں پہ دی گئی ہے۔ چنانچہ نور الدہر، شاہ اسلام، قاسم صاحبقران اور بدیع الزماں سب ہی معرکہ آرا نظر آتے ہیں۔ لیکن تین سو صفحوں تک رستم یعنی ہیرو کا نام بھی نظر نہیں آتا۔

جلد سوم میں گویا ہم کلائمکس (CLIMAX) پر پہنچ جاتے ہیں مگر یہاں طلسم ہوش ربا کی طرح زبردست معرکہ آرائیاں نہیں۔ ایک ہزار صفحے پڑھنے کے بعد ایک ایسی داستان آتی ہے جو فیصلہ کن ہے۔ ایک جنگ ہوتی ہے۔ ہفت پیکر مارا جاتا ہے اور اس کے بعد لشکر اسلام "طلسم خیال سکندری" کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ "ہفت پیکر" میں چھوٹے اور بڑے ساحر سب ایک ہی سحر کرتے ہیں کبھی شعلہ ہائے آتش بھڑکا دیے کبھی برف کی سلیں برسنے لگیں

---

[1] د ۵ طلسم ہفت پیکر ص ۱۰۸، ۱۰۷

یا گولہ مارا تو دریائے ذخار موجیں مارنے لگا۔ ہوش ربا کی طرح یہاں کوئی Spe-cialise نہیں کرتا

جلد سوم میں صفحہ ۵ سے ۹۳ تک داستان جہاں گیر اور ۹۴ سے ۲۳۱ تک داستان بادشاہ اسلام ہے۔ ان دونوں داستانوں کا مرکز سے کوئی خاص تعلق نہیں اس فنی نقص سے فسانے کا ربط ختم ہو جاتا ہے اور تسلسل بکھر جاتا ہے۔ جو قاری طلسم ہفت پیکر کو مطالعے کی غرض سے اٹھائے گا اسے محض ضمنی داستانوں کی وجہ سے بہت جلد بے زار ہونا پڑے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک سیدھی سڑک میں رکاوٹیں پیدا کر کے اسے پیچدار بنا دیا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ مصنف نے بھی ضمنی داستانوں کو بس ضمنی ہی سمجھا ہے اور ان کے لکھنے میں اپنے تخیل کو زحمت دینا گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ ساری داستان میں سب سے ناقص حصہ یہی ہے۔ ان دو داستانوں کے بعد رستم کا ذکر آتا ہے۔ وہ باغ نسترن تک پہنچ جاتے ہیں۔

نسترن جادو کی وزیر زادی شفق خوں خوار ایک زبردست ساحرہ ہے یہاں قصے میں کچھ جان پڑتی ہے۔ اس جگہ شفق خوں خوار کی معرکہ آرائی بیان کی جا سکتی تھی۔ مگر یہاں بھی مایوسی ہوتی ہے کیوں کہ شفق خوں خوار بھی طلسم کشا پہ عاشق ہو جاتی ہے۔ اس لئے معرکہ آرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مصنف کو اس کے سحر و ساحری کے کرشمے دکھانے میں طبع پہ زور ڈالنا پڑتا۔ اس لئے بڑی خوبی سے پہلو بچا لیا گیا اور شفق خوں خوار کا طلسم کشا پر عاشق ہونا دکھا کر اس مشکل کو آسان کر لیا گیا۔ باغ نسترن کوئی پر اثر جگہ نہیں۔ اس کے فتح ہوتے ہی مصنف طلسم کشا کو کوہ قاف پہنچا دیتا ہے۔ جہاں بہت سے دیوان قاف وغیرہ کو شکست دے کر اپنا خراج یعنی ایک عدد معشوقہ کو لے کر طلسم واپس لوٹتے ہیں۔ یہ پوری داستان بار گزرتی ہے۔ اس کے بعد خسرو شیر دل فرزند صاحبقراں ایک نقاب پوش بن کر

آتے ہیں اور لشکر اسلام سے ٹکر لیتے ہیں۔ ہفت پیکر کو اب بھی نظر انداز کیا گیا ہے
شیدائے غنچہ دہن نام کی ایک ساحرہ لشکر اسلام سے لڑنے آتی ہے اور خسرو شیر دل
پر عاشق ہو جاتی ہے باغ نسترن کا تو خاتمہ ہو چکا۔ اب ہفت پیکر طلسم ظاہر چھوڑ کر
طلسم باطن کے قصر عشرت میں آچکا ہے وہاں پر اس کا لشکر جمع ہوتا ہے۔ ایک ساحر
ممور قلم کش آتا ہے۔ یہ ہوش ربا کے مصور تصویر کش کا چربہ ہے۔ سیلاب دریا
باد سحر دریائی کرتا ہے۔ حالانکہ ایسے ایسے سحر ہوش ربا کے ادنیٰ ساحر بھی
کر دیتے ہیں۔ دونوں ہفت پیکر کے بڑے زبردست ساحر ہیں۔ مگر عیار ان کو
چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی ان کا رنگ بھی نہ جما تھا کہ خاتمہ ہو گیا۔

صفحہ ۵۸۱ سے ایک اور ضمنی داستان شروع ہوتی ہے۔ "طلسم خیال سکندری" کا
بادشاہ ہفت پیکر کی مدد کا وعدہ کرتا ہے۔ طلسم خیال سکندری کے ساحروں
کی آمد شروع ہوتی ہے۔ سامان سحر طراز اگر قیامت برپا کرتی ہے۔ ایک ایسا
سحر کرتی ہے کہ امیر حمزہ اسم اعظم بھول جاتے ہیں اور رستم کی فوج بیکار ہو جاتی ہے
لیکن باطل کی یہ فتح دیرپا ثابت نہیں ہوتی نور آہی غضنفر آکر ساحرہ کو فی النار
کر دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں غضنفر اور جہانگیر کی طویل داستانیں ہیں۔ گلنار زعفران
پوش ہفت پیکر کی امداد کو آتی ہے۔ وہ بھی رستم پر عاشق ہو جاتی ہے۔ صفحہ
۸۲۱ سے مصنف زبردستی ہفت پیکر کی داستان کو پس انداز کر کے "خیال سکندری"
کی داستان شروع کر دیتا ہے جو بے کار کی طوالت ہے۔ خیال سکندری کا ایک
فرستادہ ساحر رستم کو گرفتار کر کے ایک دشت میں آوارہ کر دیتا ہے لیکن رستم
کے لئے سب برابر ہے۔ ان کا سر یہاں بھی نیچا نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ فتح یاب
ہوتے ہیں اور اسی تفصیل میں تین شاہزادیاں عاشق ہوتی ہیں۔ یہ دراصل
"خیال سکندری" کا ایک قسم کا تعارف Introduction ہے

تاکہ قاری کی دلچسپی اس نئے طلسم کی طرف بڑھ جائے یا یوں سمجھئے کہ کئی سو صفحوں کا
اشتہار ہے اور واقعی ہفت پیکر جیسی کم پایہ کتاب کے بعد مصنف کو اپنی کسی
اور نئی کتاب کے لئے راستہ تیار کرنا ایک ایسا مشکل مسئلہ تھا کہ اس کے لئے
تین سو صفحے بھی کافی نہیں۔ چنانچہ یہ ضمنی داستان یا اشتہار ۳۲۹ صفحوں پر پھیلا ہوا
ہے اور ان ہی صفحوں میں پوری کتاب کی چند اچھی داستانیں بھی ہیں جیسے کسی
نمونے Trailer میں فلم کی ساری خوبیاں جمع کر دی جاتی ہیں یا ایک
خراب تصویر کو نمونے کے ذریعہ اچھا بنایا جاتا ہے۔ قمر اس سلسلے میں تعریف کے
مستحق ہیں کہ وہ قارئین کو کس خوبی سے مسحور کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس داستان کے بعد کہانی اپنے عروج کی طرف بڑھتی ہے ایک آخری
فیصلہ کن جنگ ہوتی ہے جس میں ہفت پیکر بدست طلسم کشتا مارا جاتا ہے
اس کے بعد لشکر اسلام جیسا کہ امید تھی "طلسم خیال سکندری" کی طرف کوچ
کرتا ہے۔ یہاں پر مصنف نے پہلے ہی سے ضمنی داستانوں کے لئے زمین تیار کرلی
یعنی ہر شاہزادے کو طلسم کی طرف علیحدہ علیحدہ روانہ کیا ہے۔

"ہفت پیکر" میں خامیوں کے علاوہ چند خوبیاں بھی ہیں۔ بعض جگہ عبارت
میں ایسی رنگینی اور دلکشی مصنف نے پیدا کی ہے کہ اس میں چار چاند لگا دیئے
ہیں۔ قمر کے پاس الفاظ کے ذخیرے کی کمی نہیں بعض جگہ تخیل نے بھی عجیب
عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ اس داستان کے چند اچھے نمونے ملاحظہ ہوں۔

> "دیکھا درۂ کوہ میں ایک صندوق لٹک رہا ہے۔ جب ہوا چلتی ہے
> ڈھکنا کھلتا ہے۔ خواجہ نے دیکھا اس صندوق میں چاندی کے برتن بھرے
> ہوئے ہیں۔ خواجہ کے منہ میں پانی بھر آیا جھپٹ کر درۂ کوہ میں پہنچے
> صندوق کی زنجیر کو ڈھیلا کیا۔ صندوق زمین پر آیا۔ خواجہ برتن نکالنے لگے

اور ایک ایک کر کے زنبیل میں رکھنے لگے۔ جب دو چار برتن خواجہ نے نکالے اور داخل زنبیل کئے۔ رستم نے دور سے دیکھا۔ پکار کر آواز دی کہ نامدار احتیاط شرط ہے۔ یہ مقام ویران اس میں مال کا ہونا خالی از علت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کسی بلا میں پھنس جائے۔ خواجہ نے رستم کو جواب نہ دیا سب باسن نکال لیے۔ جب کوئی برتن باقی نہ رہا چاہا صندوق کو بھی زنبیل میں رکھوں کہ صندوق سے آواز آئی کہ اے شخص کیوں دیوانہ ہوا ہے کیوں ہمیں ستاتا ہے۔ ہمارے آرام میں فرق ڈالا ہے۔ اب چاہتا ہے کہ قید کرے بس چلا جا۔ خواجہ نے اس پر بھی کچھ خیال نہ کیا۔ صدوق کو اٹھایا قصد ہوا کہ زنبیل میں رکھوں ایک تڑاقا ہوا دیکھا خواجہ نے بڑہ شق ہوا ایک پتیلی سنہری نکلی۔ خواجہ نے چاہا کہ بھاگوں صندوق میں ہاتھ لپٹ گیا۔ اس پتیلی نے ہاتھ پکڑ کر کہا اے شخص تو کون ہے کہ ہمارے سمجھانے کو نہ مانا ہمارے آرام میں فرق ڈالا اب تجھ کو لے چلوں گی۔ نام تو اپنا بتا۔ سیکڑوں ہزاروں مسافر ادھر سے گزرے مگر کسی نے ہم کو نہ ستایا تجھ کو اپنی جان کا خوف نہ آیا۔[1]

" اب خواجہ نے دیکھا کہ وسط صحرا میں ایک کنواں ظاہر ہوا۔ گرد اس کنوئیں کے زمین داروں نے آکر ہجوم کیا۔ کئی سے برہمن پتمبری دھوتیاں باندھے ہوئے۔ ماتھوں میں تلک لگا ہوا اگر داگرد کنوئیں کے بیٹھ گئے۔ پوتھیاں نکالیں اور جاپ کرنے لگے۔ ہر طرف یہی ہنگامہ ہے کہ یا خداوند خیال سکندری تیری قدرت کے قربان کہ اس صحرا میں یہ سامان عطا فرمایا ہے۔ ناگاہ کنوئیں سے شعلے نکلنے لگے جس مقام پر صبح اجہاں آسا

---

[1] طلسم ہفت پیکر جلد سوم ص ۱۱۳

کھڑی ہیں دو شعلے بھڑک کر اس مقام پر آ لئے۔ گرد ان کے سروں کے چرخ مارا اور پھر شعلے کنوئیں میں پہنچے جہاں آرا و صہبا پاس کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں یا اپنے مقام سے بڑھیں اور طرف کنوئیں کے چلیں ....

اے خواجہ مجھ کو نہ روکو میں غل مچاؤں گی کہ عمرِ عیار مجھے روکتا ہے عمرو نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہزار ہا گنوار جمع ہیں۔ صہبا و جہاں آرا اسی جوش و خروش میں قریب کنوئیں کے پہنچیں۔ پہلے سجدہ کیا پھر جھانک کر دیکھا۔ پکار کر آواز دی کہ یا خداوندمیں آؤں اور قہقہہ مار کر ہنسیں۔ جہاں آرا نے کہا کہ مادر مہربان دیکھ دربار قدرت آراستہ ہے۔ یہ کہکر دونوں کنوئیں میں پھاند پڑیں۔ کنوئیں سے شعلے ہائے آتش نکلے۔ اب خواجہ نے یہ معاملہ دیکھا کہ جب دونوں شاہزادیاں کنوئیں میں پھاند پڑیں اس قدر شعلہ ہائے آتش نکلے کہ سب زمین دار جل کر خاک ہوئے۔ تھوڑے عرصے میں خواجہ نے دیکھا کہ کوئی زمین دار نہیں ہے۔ جا بجا خاک کے ڈھیر ہیں۔ ہوش اڑ گئے .... چل کر دیکھو کہ اس کنوئیں میں کیا ہے مگر بہ صورت اصلی جانا بہتر نہیں۔ زنبیل پہ ہاتھ ڈالا ایک کھال بندر کی نکالی اس کو جسم پر آراستہ کیا..... عمرو بندر کی شکل بنے قریب کنوئیں کے آئے۔ اب جو جھانک کے دیکھا تو کنوئیں میں پانی معلوم ہوا۔ خواجہ نے سر ہٹا لیا پھر جو جھانکا تو یہ معلوم ہوا کہ پانی بھی کنوئیں میں نہیں ہے۔ اس قدر اندھیرا ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ کئی مرتبہ خواجہ نے جھانکا اور ارادہ کیا کہ کنوئیں میں پھاند پڑوں مگر دل نے قبول نہ کیا۔ .... تیسری مرتبہ جھکے تو دیکھا ایک شخص لیم و شحیم تخت پہ بیٹھا ہے۔ گرد ہزار ہا تاج دار تاج سروں پر لباس فاخرہ زیب جسم۔ لیکن تاج داروں کے ہزار ہا

ساحران غدار دنگل ہائے آہنی پر بیٹھے ہیں۔ ناچ ہو رہا ہے۔ محفل عیش و نشاط گرم۔ مے خوار بے شرم عمر دنے جو یہ جلسہ دیکھا اور زیادہ خائف ہوئے دل میں کہا کہ اے خواجہ یہ کیا معرکہ ہے۔ ایک مرتبہ پالی دیکھا دوبارہ اندھیرا، سہ بارہ دریا دعالی۔ اس سوچ میں خواجہ بیٹھے ہیں کہ جنگل سے دھڑاکے کی شیر کی آواز آئی۔ دیکھا کہ ایک شیر ببر کچھار سے نکلا۔ ڈرتا ہوا اسی طرف آتا ہے۔ خواجہ نے چاہا اچک کر درخت پر جاؤں کہ وہ شیر قریب آگیا اور خواجہ عمرو پر آنکھیں نکالنے لگا۔ خواجہ گھبرا گئے کہ اب کس طرف جاؤں وہ شیر قریب آگیا۔ خواجہ عمرو کو جلدی میں کچھ نہ بن پڑا۔ جان کے خوف سے کنوئیں میں پھاند پڑے وہ شیر طرف صحرا کے غائب ہو گیا"۔[1]

..... بغراد شاطر یہ باتیں کر رہا ہے اور مبہوت بیٹھا ہے کہ خواجہ عمرو نے اس عرصے میں سب کو شراب پلائی اور ہر ایک کے سامنے اشعار گاتے جاتے ہیں ...... اشعار سنتے ہی اور شراب پیتے ہی ہر شخص محو ہو گیا کسی نے موتیوں کا مالا، یا کسی نے کلاہ اتار کر دی کوئی اچکن اتارنے لگا۔ کہتا جاتا ہے کہ اے مہتر چپلاوا آج کس لطف سے تم نے شراب پلائی ہے، کیا کیا تماشے نظر آ رہے ہیں ذرا دیکھو تو ہم نے دو سر خوار نظر آتے ہیں۔ آپس میں اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس صحبت میں آ بیٹھیں۔ کبھی ان سے رسالدار نے کہا کہ کیوں بھائی تمہاری گود میں کتیا نے بچے دیے ہیں۔ رسالدار نے جواب دیا کہ کتیا نے پیشاب مقرر کیا ہے اور تم کیسے دوست ہو کہ دیکھ رہے ہو۔ مارو اس حرام زادی

---

[1] طلسم ہفت پیکر جلد سوم ص ۹۲۹، ۹۳۱

کو۔ کمیدان اپنے مقام سے اٹھے باعث یہ تھا کہ رسالدار کو عارضۂ فتق تھا آگے ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کمیدان نے اٹھکریلات ماری۔ رسالدار گھبرا گئے۔ ہائے کر کے گرے مگر کمیدان کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ دونوں گرے اور گرتے ہی بیہوش ہوئے۔ ساری محفل میں غدر مچا ہوا ہے۔ کوئی ناچتا ہے کوئی مسخرہ پن کر رہا ہے لقراط ثانی نے جو محفل کا یہ حال دیکھا پکار کر آواز دی کیا غضب کیا میری محفل کو بازار سمجھتے ہو جو جائیں بائیں کر رہے ہو۔ خاموش بیٹھو ورنہ سب کو سنگ سیاہ کر دوں گا۔ بہت پچھتاؤ گے۔ یہ کہکر اپنے مقام سے اٹھا مگر تال دسم دل میں بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح ہاتھ ہلاتا ہوا اٹھا۔ جیسے ہی اپنے مقام سے اٹھا بے ہوشی اپنا کام کر چکی تھی۔ لڑکھڑا کر گرا۔ خواجہ عمرو نے دوڑ کر زیر سر ہاتھ دیا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا سر پھٹ جائے حمزہ کی طرف سے مجھ پر آفت آئے۔ یہ سوچ کر لقراط ثانی کو بچایا۔ جب سب بے ہوش ہوئے تو خواجہ نے اپنے نام کا نعرہ کیا۔" [۱]

ان تینوں نمونوں کی عبارت پر غور کیا جائے تو ہمیں سب سے زیادہ سادگی یہاں متاثر کرتی ہے۔ دوسری بات اس میں یہ ہے کہ اسلوب کی سادگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ پہلے نمونے میں خواجہ عمرو صندوق کے لالچ میں کیسے کیسے جتن کرتے ہیں۔ دوسرے میں کنوئیں کا منظر نہایت دلچسپ ہے۔ خواجہ عمرو شبر کو دیکھکر ایسے گھبرائے کہ "جان کے خوف سے کنوئیں میں پھاند پڑے"۔ عمرو کے پھاندتے ہی شبر جنگل میں غائب ہو گیا۔ تیسرا نمونہ بھی بے حد دلچسپ اور موثر ہے۔ ناچ رنگ کی محفل آراستہ ہوتی ہے۔ شراب کا دور چلتا ہے

---

[۱] طلسم ہفت پیکر جلد سوم ص ۱۹۱ ، ۲۹۲

اس داستان میں تمر کی سادگی اور پرکاری کا ہلکا سا رنگ سامنے آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بیان کو رنگین بنانے میں کمال رکھتے ہیں اور سادگی بیان کے لوازم کو ترک نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ "ہفت پیکر" ایک بے ربط داستان ہے جو خوبیوں سے کسی حد تک معرا ہی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی ناکامی کا سب اہم سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں لشکر اسلام کے مخالفین کو گمراہ دبا گیا ہے۔ مصنف نے بہت زیادہ جانب داری سے کام لیا ہے۔ لشکر اسلام کا ہر سردار اپنی جگہ ایک روشن مشعل ہے۔ مگر کفار میں کوئی بھی شخص بہادر نہیں ہے۔ ہفت پیکر خود ایک بے کار، بزدل اور کم زور ہستی ہے جس کا افراسیاب نودر کنار ہوش ربا کے دوسرے ساحروں سے بھی کوئی موازنہ جائز نہیں۔ غرض یہ کہ اس نقص نے کشش میں بے لطفی پیدا کر دی ہے۔

طلسم خیال سکندری

طلسم خیال سکندری منشی احمد حسین قمر کی تصنیف ہے۔ اس کے مطالعے سے
ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک منزل سے گزر رہے ہیں جس کے مناظر اور ماحول
ان منزلوں سے جن کو ہم طے کر چکے ہیں ایک نمایاں یکسانیت رکھتے ہیں۔ ہوش ربا
کے سدا بہار مرغزاروں کی طرح طلسم خیال بھی ایک وادی ہے مگر اس کا سبزہ زار
تخیل پژمردہ ہے۔ نیو یارک کے سکائی سکریپر بھی رہائش گاہ ہیں اور ہندوستان
کی پست عمارتیں بھی۔ دونوں کا بنیادی مقصد اور تعمیر تقریباً ایک ہی ہے مگر فرق
ظاہر ہے۔ یہاں پر ہم کو وہ بلندی اور خوبصورتی نہیں ملتی جس کے ہم متلاشی ہیں۔
ایک ہی تکرار چلی گئی ہے جیسے پناہ گزینوں کے لئے جلدی جلدی ایک ہی شکل
کے ہزاروں مکان بنا دئے جائیں۔ ضرورت کے لحاظ سے وہ اہم اور مفید
ہو سکتے ہیں مگر ان کا کوئی جمالیاتی پہلو نہیں۔ ہر طرف ایک پریشان کرنے والی
یکسانیت کا وجود ہے۔ کچھ اسی قسم کا فرق ہوش ربا اور خیال سکندری
میں ہے۔

اس سے پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ "طلسم ہفت پیکر" ایک بے ربط اور
فرسودہ داستان ہے مگر طلسم خیال سکندری اس فرسودگی میں کچھ آگے ہی
ہے۔ اگرچہ تمر کہیں کہیں کتنوڑے بہت ابھرے ہیں مگر مکمل طور پر اس داستان
کو ایک ناکامیابی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے

کہ یہ ۲۹۲۵ صفحوں کی عظیم داستان (جلد اول ۹۸۴ دوم ۹۷۲ اور سوم ۱۰۶۹) صرف ایک سال میں مکمل ہو گئی۔ ضخامت میں یہ کچھ ہفت پیکر سے زیادہ ہے بلکہ واقعات کے لحاظ سے بھی بلند ہے۔

ہوش ربا کا اثر انداز ہونا تو لازمی تھا مگر اس طلسم میں بہم کو بوستان خیال کا بھی ایک مبہم سا پرتو نظر آتا ہے۔ اس داستان میں نئے کرداروں میں بھی کوئی نہیں ابھرتا۔ بقراط ثانی جو خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے بادشاہ طلسم ہونے کے باوجود کچھ نہیں ایک دو دفعہ لوح طلسمی کو عمرو بچا کر لے جاتا ہے۔ ویسے لشکر اسلام کے لئے بالکل بے ضرر ساحر ہے۔ افراسیاب کے بلند ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ سکندر ثانی لاچین کی طرز پر سابق بادشاہ طلسم ہے جس کو بقراط نے قید کر دیا تھا۔ لاچین کی مانند سکندر ثانی اپنے مخالف سے ٹکر لینے کا اہل نہیں بلکہ جابجا بقراط کے ہاتھوں شکست اٹھاتا ہے۔ جمشید زریں قرکش سکندر کا بھائی ہے اس کو کوکب کا عکس سمجھ لیجئے۔

شاہزادیوں میں شعلہ جوالا اور بہار بے مرصع پوش کے نام پیش پیش ہیں۔ یوں تو نور الدہر کی معشوقیں لاتعداد ہیں جو حسین ساحرہ آتی ہے وہ عام طور پر طلسم کشا پر عاشق ہو جاتی ہے۔ نجم اختر شناس اور حکیم ارسطوئے ثانی بھی نور الدہر کے معتقدین میں سے ہیں۔

اس کتاب کا اشتہار تو ہم طلسم ہفت پیکر ہی میں شائع کر چکے تھے اب لکھتے ہیں کہ

"حوالہ اس طلسم کا ہفت پیکر ہی میں دے چکا ہوں۔ اتفاقاً ایک روز منشی پیارے لال نرائن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا سبب ہے کہ آپ قلم نہیں اٹھاتے۔ طلسم خیال سکندری

کیوں نہیں تحریر کرائے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ پانچ مہینے ہفت پیکر کو تمام
کئے ہوئے گزرے"

گویا خیال سکندری کو ۱۹۰۰ء میں شروع کیا گیا اور اسی سن میں تکمیل بھی ہو گئی۔

جلد اول میں سب سے پہلے سکندر اعظم کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ اس مشہور شخصیت کے فسانے کا ہندوستانی رخ ہے۔ قمرؔ نے قصے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سکندر دارا کا خراج گذار تھا۔ ایک دفعہ خراج ادا نہ کرنے کے باعث دارا نے فوج کشی کی۔ سکندر کی سپاہ قلیل تھی اس نے فرار ہو جانے کا سوچا مگر ارسطو کے کہنے سے مقابلے کے ارادے سے صف آراستہ ہوا یہاں پر فاختہ اور تیتر کا Symbol دکھایا گیا ہے۔ سکندر فاختہ اور دارا تیتر۔ فاختہ جیت جاتی ہے اور سکندر کی ہمت دوگنا ہو جاتی ہے۔ لڑائی کا آغاز ہوا کئی دن تک میدان داری ہوتی رہی۔ جنگ مغلوبہ نہ ہونے پائی تھی کہ دارا کو اس کے دو نمک حرام ترکی غلاموں نے قتل کر ڈالا۔ یہاں پر بڑا زبردست An-achronism ہے۔ سکندر دوربین کے ذریعہ دارا کے لشکر کا معائنہ کرتا ہے بھلا اس زمانے میں دوربین کہاں سے آئی۔ یہ تو ایک جدید ایجاد ہے مگر شکسپیر کی طرح داستان گو بھی ان باتوں کا ذرا کم خیال رکھتا ہے۔ اس کے بعد دارا کی لڑکی روشنک سے سکندر کی شادی ہو جاتی ہے ایک اژدہا سکندر سے مدد مانگتا ہے۔ اس کے دشمن بچھو کو بارود سے فنا کر دیا جاتا ہے یہ ایک اور Ana-chronism ہے۔ اس کے بعد سکندر کو دریا کا سفر درپیش ہوتا ہے۔ کئی مہینے بعد ایک مقام پر پہنچے ارسطو سے کہا استاد اس مقام پر ایسی چیز بنا دو کہ دور سے دیکھنے والا دیکھے اور جہاز کو بچا لے جائے۔ ارسطو نے کہا۔ اے شہریار اس مقام پر پانی چرخ مارتا ہے۔ طبقہ زمین کا پھٹا ہوا ہے۔ کوئی شے یہاں نہیں بن سکتی

سکندر نے مجبور ہو کر اژدہے کو بلایا۔ وہ سمندر میں کھڑا ہوا اس کے حلق میں سیسہ ڈالا گیا اور وہ ایک میل بن گیا۔ اسی کا نام سد سکندری ہے۔ کئی ہزار برس اس بات کو گزرے۔ (یہ لکھ کر بھی دوربین اور بارود کے ذکر سے باز نہیں رہتے) اس قصے کا تاریخ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں جو قابل قبول ہو۔ تاریخ یا فسانہ یونان سے ہندوستان تک پہنچنے میں بالکل مسخ ہو چکا ہے۔

اصل داستان جہانگیر کی مہم سے شروع ہوتی ہے۔ ایک ساحرہ عجائب نگار ایک آندھی کے ذریعہ تمام لشکر اسلام کو تتر بتر کر دیتی ہے۔ ہفت پیکر کی جلد اول میں اسی قسم کی آندھی سے قصے کا آغاز کیا گیا تھا۔ نورالدہر اصل فاتح طلسم اس ساحرہ کو قتل کرتے ہیں۔ قصر سکندری با قصر عشرت میں بقراط ثانی ہمراہ بارہ ہزار شاہزادیوں کے رہتا ہے۔ چیدہ چیدہ شاہزادیاں لشکر اسلام کے خلاف روانہ کی جاتی ہیں مگر سب مختلف شاہزادوں کی آغوش کی زینت بن کر بقراط کی مخالفت پر تل جاتی ہیں۔ شروع میں ایک داستان جس میں لندھور اور مالک وغیرہ سحر میں مبتلا ہو کر لشکر اسلام کی مخالفت کرنے لگتے ہیں اور ابراہیم مع غضنفر کے شب خون مار کر ان کو بری طرح تنگ کرتے ہیں۔ دلچسپ ہے۔ لوح محفوظ نورالدہر کو مل جاتی ہے۔ ضمنی داستانیں بے حد ہیں اور وہ داستان جس میں صاحبقران چمن زار فتح کرتے ہیں خیال سکندری کی متعدد داستانوں سے مرتبہ رکھتی ہے۔

کتاب کے آخر میں 'بوستان خیال' کا اثر بہت قوی ہو جاتا ہے۔ گنبد گیتی نما کی سیر ہے۔ اس قسم کے بے معنی جلسوں کا ذکر جہاں دوست دشمن سب یکجا ہوتے ہیں بوستان خیال میں ہی پائے جاتے ہیں۔ حکیم ارسطوئے ثانی بھی بوستان خیال ——— کے سے جلسوں کا چربہ ہیں۔ ایک جگہ نورالدہر ایک شہر میں داخل ہو کر ایک بوڑھی عورت عاقلہ بالغہ کے گھر میں آرام کرتے ہوئے ایک کہانی سنتے ہیں جو وہ اصل

مہم کے لئے ایک کلید ہے۔ بالکل ایسا ہی واقعہ شاہزادہ معزالدین کے ساتھ حدائق
نظارہ میں پیش آتا ہے۔ باغ ہمیشہ بہار کا ذکر اور نورالدہر کا ایک شاہ صاحب کے
چیلوں میں شامل ہو کر بھیک مانگتے ہیں سب بوستان خیال کے رنگ ہیں۔

جلد دوم میں زیادہ تر ہوش ربا کی نقل مد نظر رکھی گئی ہے۔ جلد اول میں تو پھر
بھی داستان گو نے بوستان خیال کے رنگ کو طلسمی طرز میں تبدیل کرنے کی کوشش
کی تھی اور جدت دکھائی تھی۔ مگر یہاں وہ دوبارہ ہوش ربا کی طرف متوجہ
ہو جاتے ہیں۔

طلسم ظاہر کا تو خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب لشکر اسلام باری باری طلسم باطن
میں داخل ہو رہا ہے۔ صاحبقران مع علم شاہ کے جن کو کسی ساحرہ نے انگشتر جمشیدی
عنایت کی ہے تاکہ سحر اثر نہ کرے وہ طلسمی فتح کرتے ہوئے قلعہ طلسمی میں داخل ہوتے
ہیں جس کی فوراً شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ شاہزادیاں حسب معمول عاشق
ہوتی رہتی ہیں۔ نورالدہر سکندر ثانی بادشاہ سایلی کو گرفتار کرتے ہیں اور ایرج سے جن کو
یاقوت جن مدد گار ملا ہے برابر مقابلہ رہتا ہے ایرج باوجود طلسم کے فارغ نہ ہونے کے
ابھی آتش مزاجی کی وجہ سے اس فکر میں رہتے ہیں کہ لوح حاصل کر لوں۔ حکیم اشفاق
حکمت بیگ بھی نورالدہر کے ہمراہ ہیں۔ یہاں بوستان خیال کا اثر غالب
ہے۔ عیاروں سے بھی ایک داستان میں مقابلہ پڑتا ہے مگر بہت جلدی زیر ہو جاتی
ہیں۔ اور ان کی ملکہ صہبا سے گلزار افزا کی عمرو سے شادی ہو جاتی ہے۔ دریائے عجائب
کے پل پر بہادر پر تیور الوس کی جنگ دکھائی ہے وہ جدت سے اور اچھی لکھی ہے
خرد زن فرنگی بن فرامرز کی داستان بڑے زور شور سے شروع ہوتی ہے مگر اس قدر
اچانک طور پر فوراً ختم کیا جاتا ہے کہ سب لطف خاک ہو جاتا ہے

جس طرح ہوش ربا میں مہتاب سے زہرہ جبین نے شراب پلا کر بے ہوش کیا

اور اس کا جسم چیر کر لوح رکھدی تھی اسی طرح ابتدا میں تاتاری ہفت جوش کو بلا کر دھوکے سے لوح طلسم اس کے جسم پر پوشیدہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی جان سے خوف زدہ ہو کر دریائے قلزم میں پناہ لیتا ہے۔ ہوش ربا میں دریا کا نام دریائے نیل تھا۔ تیسری جلد میں قصے میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے کیونکہ ہفت جوش نور الدہر کے ساتھ ہو جاتا ہے اس کے برخلاف زمہریر یا سعد نازی سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ جلد دوم کے آخر میں اپنی تصنیف کردہ تاریخ میں قمر لکھتے ہیں کہ

غم دہر نے یوں پریشاں کیا   شگوفہ دکھایا نئے رنگ کا (؟)

قمر خود تسلیم کرتے ہیں کہ " یہاں تک کہ طلسم ہفت پیکر کو معشوقان طناز نے فتح کرایا "۔ ان طلسمات میں اب زور بازو کا کوئی کام نہ تھا اور کیوں نہ ہو۔ آخر قمر بھی تو ایک ایسی سوسائٹی کے نمائندے تھے جو فقط ماہ و شراب و ساقی کے قائل تھے۔

دریا کا منظر ملاحظہ ہو۔

" زمین شق ہوئی۔ پانی پیدا ہونے لگا۔ اس قدر فوارے چلے کہ دریا ہو گیا۔ دم بھر میں ایسا دریا تیار ہوا کہ پختہ گھاٹ بنے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ شوالے کنارے کنارے سیڑھیاں خشتی۔ برہمن وغیرہ اشنان کر رہے ہیں۔ پوتھیوں کا جاپ ہر ہر کی صدا بلند ہے۔ جو آتا ہے نہا کر چلا جاتا ہے۔ کوئی دھوتیاں نچوڑ رہا ہے " [1]

دریا کا منظر نہایت دل کش انداز میں پیش کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھا ہے۔ عبارت بھی رنگین اور موثر ہے۔

خواجہ عمرو نے بلک بلک کر خدا سے جو دعائیں مانگی ہیں وہ کچھ کم دلچسپ نہیں اس لئے نمونۃً اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

" اے رحیم و کریم ان ظالموں کی بد عقلی سے بچا لے۔ میرے تیرے کوہ اندیپ

[1] طلسم خیال سکندری جلد دوم ص ۸۲

پر وعدہ ہو چکا ہے۔ تو بھی سچا ہے تیرا وعدہ بھی سچا ہے۔ مگر اس وقت ملک الموت کا سامنا ہے۔ میں ان کے نام سے ڈرتا ہوں۔ میں نے اپنے گھر میں ان کو کبھی نہیں آنے دیا۔ علاوہ اس کے میں ایک مرد معصوم دم نکلتے ہی بہشت میں جاؤں گا تو نے جو جواہرات کے مکان بنائے ہیں ان سب کو زنبیل میں رکھ لوں گا۔ تجھ کو پھر مشکل پڑے گی۔[1]

یہ عبارت خواجہ عمرو کے کردار پر بہترین تبصرہ ہے قمر نے اس کو نہایت دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں سادگی بھی ہے اور کشش بھی۔ اب ایک منظر اور ملاحظہ ہو۔ اس میں باغ و بہار کی نقل کس حد تک نمایاں نظر آتی ہے۔

"مگر سامنے ایک کوہ ہے۔ اس پر ایک چراغ روشن ہے۔ لاکھ ہوا کا زور ہوتا ہے مگر وہ چراغ گل نہیں ہوتا۔ روشنی دم بدم بڑھتی جاتی ہے نورالدہر کے پیچھے شبرنگ تھا۔ فرمایا کہ اے شبرنگ یہ چراغ خالی از علت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کامل کا گذر ہے۔"[2]

جلد سوم میں قدرے آہستہ آہستہ کھسکتا رہتا ہے۔ ہفت جوش نورالدہر کا شریک ہو کر لوح دینے کی غرض سے آتا ہے مگر ایرج دھوکے سے لوح لے لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوح فوراً ہی چھین جاتی ہے اور کافی رد و کد کے بعد طلسم کشا یعنی نورالدہر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ بقراط ثانی کسی جگہ بھی جم کر نہیں لڑتا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ حکیم اعاز مصری کے شعبدے بوستان خیال کے رنگ میں ہیں۔ خود حکیم کی پالیسی عجیب طرفہ طرفی ہے وہ بقراط کا بھی شریک ہے اور جاجعفر آن کو کئی دفعہ شعبدوں میں مبتلا کر دیتا ہے مگر ساتھ ساتھ لشکر اسلام

---

[1] طلسم خیال سکندری جلد دوم ص ۳۵۴

[2] طلسم خیال سکندری جلد دوم ص ۵۳۰

سے توجہ کا خواہاں ہے۔ آخر میں لبقرا ثانی ملکہ مروارید کے پاس قلعہ مرادِ میدِ نگار میں پناہ لیتا ہے اور وہیں ایک جنگ مغلوبہ میں نور الدہر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے ایک اہم نقص یہ ہے کہ مروارید کے انجام کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس طرح "طلسم ہفت پیکر" میں قمرِ مصر الغرائب کو حذف کر گئے تھے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"خواجہ پھرتے پھراتے ایک ویرانے میں آئے کہ یکایک کراہنے کی آواز کان میں آئی۔ اسی آواز کی جانب چلے جب قریب پہنچے تو دیکھا ایک بیمار پڑا کراہ رہا ہے۔ خواجہ کو رحم آیا پوچھا" اے بیمار تو کون ہے کہ جو یہاں پڑا ہے" اس نے کہا" میں سوداگر ہوں۔ جب یہ عارضہ ہوا تو لاکھوں روپے صرف کئے۔ نوکر چاکر موجود رہے۔ جب روپیہ صرف ہو گیا تو سب نے جدائی کی۔ اب میں یہاں حیران و پریشان ہوں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ عمرو نے کمر سے کچھ پیسے نکالے قریب آکر چاہا دوں ...... "[1]

شاید پیسے کھوٹے تھے مگر نہیں۔ اس قسم کی سخاوت خواجہ عمرو سے بعید نہ تھی مگر یہ جملہ ایک بڑا انسانی پہلو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کیسا ہی لالچی کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی اپنی طرزِ ادا کو چھوڑ کر نیک کام کی طرف متوجہ ہو ہی جاتا ہے۔ اس واقعہ سے خواجہ عمرو کا کردار اور زیادہ مسلم اور قوی ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی "باغ و بہار" کی تھوڑی سی جھلک نظر آتی ہے۔ اب میاں ساحر کے سحر پڑھنے کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ ایک نخل کے نیچے بیٹھے ہیں اور سحر پڑھ رہے ہیں۔

"کلوا بھیروں نار سنگھ لونا چماری گوگل داس مرچیا جن پکے پل والا پیپل کے پیڑ والا ہنومنت سنگھ مہابیر کوئل داس سینا سنی گورا پاربتی دریا سنگھ جاب خاں"[2]

---

[1] طلسم خیال سکندری جلد سوم ص ۲۷۱

[2] طلسم خیال سکندری جلد سوم ص ۳۶۵

اس داستان کی ایک آخری جھلک ملاحظہ ہو۔

"میں نے بھی سنا ہے کہ طلسم زعفران زار حکمائے اشراقین نے بنایا ہے اس طلسم کو ناز ہے کہ ان در بندوں پہ کوئی نہیں آسکتا۔ لوح اس کی ایسے مقام پہ ہے کہ جہاں ہوا کا گزر نہیں۔ آئندہ جیسا اتفاق ہو۔ اور کتاب سامری میں میں نے دیکھا کہ اہل طلسم زعفران زار مجرے گزار و منتظر ہیں" [1]

بہ حال "طلسم خیال سکندری" ایک غیر دلچسپ اور بے روح داستان ہے اور اس کی نامقبولیت کا راز دو اہم نقائص میں پنہاں ہے۔ اول یہ کہ اس میں کوئی جدت نہیں، فوری نقالی ہے۔ بعض اوقات "بوستان خیال" تو کبھی کچھ ہو جاتی ہے کہ "ہوش ربا" کا نقطہ عروج قاری پہ بار گزرتی ہے۔ دوم یہ کہ مخالفین کو نمایاں کیا گیا ہے۔ داستان میں کوئی کشش نہیں۔ ایک بے مزہ فقرہ سی کہ داستان ہو گئی ہے البتہ یہ غنیمت ہے کہ "ہوش ربا" کی طرح اس میں کوئی اشتہار بازی نہیں۔ زعفران زار کا ذکر ضرور ہے مگر بے حد کم اور مختصر۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ قاری کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ وہ زعفران زار کو تصنیف کرنے کی تکلیف گوارا کر سکیں گے جب کہ ان کے دو طلسم "تسلی" اور "بیرنگ" کاسیاب ثابت ہو چکے تھے۔

---

[1] طلسم خیال سکندری جلد سوم ص ۸۹۷

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان

کہانی رانی کیتکی انشا کی تصنیف ہے۔ یہ فورٹ ولیم کے اس دور کی
یادگار ہے، بندھ کاٹ سے الگ ہٹ کر ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی۔ انشا نے یہ کہانی ہندوستانی
میں لکھ کر مختصر قصہ گوئی کی روایت کو ایک نیا روپ بخشا۔ کہانی کے نکھار اور اس
کی دل کشی نے قاری کے دلوں کو جیت لیا۔ یہاں تک کہ یہ کہانی بڑی دلچسپی اور
شوق سے پڑھی جانے لگی۔ اس کا شمار اردو کی مشہور کہانیوں میں ہوتا ہے۔

انشا بلا کے ذہین اور بڑے ذکی تھے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی ان کا خاص مذاق
تھا۔ مگر انھوں نے اپنی شوخی اور ظرافت کا بری طرح خون کیا۔ اگر وہ درباری شاعری
کے جھمیلے میں نہ پڑے ہوتے اور اظہار ظرافت پر ذرا بھی قابو رکھتے تو ان کی شاعری
کا رنگ بالکل بدلا ہوا ہوتا۔ ویسے انشا کی نظم و نثر دونوں شوخی اور ظرافت سے
مالا مال ہیں۔ ان کو کئی زبانوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ مشرق کی کوئی زبان
ایسی نہیں جس میں کچھ کہا نہ ہو۔ اردو زبان کے تو صحیح معنوں میں نبض شناس تھے
اور عربی اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی قواعد
دریائے لطافت[1] فارسی زبان میں لکھ کر اردو پر بڑا احسان کیا۔

لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی سخاوتوں نے دھوم مچا رکھی تھی جو شاعر بھی
دلی سے لکھنؤ گیا پھر واپس نہیں پلٹا۔ انشا بھی جوانی ہی میں دلی سے لکھنؤ چلے گئے

---

[1] اس کو انشا اور قتیل دونوں نے مل کر مرتب کیا تھا۔ اردو ترجمہ پنڈت کیفی نے کیا تھا جو انجمن
ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ مصحفی پہلے ہی سے یہاں موجود تھے اور مرزا سلیمان شکوہ سلیمانؔ کے کلام پر اصلاح دینے کا کام ان کے سپرد تھا لیکن انشار کی ذکاوت اور طباعی کے آگے مصحفی کا چراغ زیادہ دنوں تک روشن نہ رہ سکا۔ ان کے پہنچنے سے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی کے بجائے انشار سے اصلاح کا کام لینے لگے غرض یہ کہ انشار کی ساری زندگی نوابوں کی صحبتوں میں گزری اور نوابوں کے زیر سایہ خوب مزے اڑائے۔ آخر میں نواب سعادت علی خاں کو اپنی بذلہ سنجی اور عجیب و غریب لطیفوں سے ان کا دل بہلاتے رہے لیکن بقول سعادت یار خاں رنگین انشار کی آخری زندگی بڑی مصیبت اور تکلیف میں گزری مگر انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

کہانی رانی کیتکی بڑی دلچسپ اور موثر و منفرد داستان ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرت اور سیرت کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں۔ اس کی دریافت کا سہرا مسٹر کلنڈ پرنسپل لا مارٹن لکھنؤ کے سر ہے۔ انھوں نے اس کو پہلی بار ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۵ء میں رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع کرایا تھا لیکن اس وقت یہ بہت غلط چھپی تھی۔ بعد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اس کی تصحیح کر کے رسالہ اردو ماہ اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد پہلی بار کتابی صورت میں "داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کے عنوان سے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی لیکن یہ امر تعجب خیز ضرور ہے کہ انشار کی ساری کہانی ہندوستانی میں ہے۔ مگر مولوی صاحب نے جب اس کو کتابی صورت میں شائع کیا تو کہانی کا عنوان تجویز کرنے سے پہلے اس پر غور نہیں فرمایا۔ داستان فارسی زبان کا لفظ ہے اور کہانی ہندی کا۔ تقسیم ہند کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں

انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں اب اس کی ضخامت ۱۵ کے بجائے ۵۰ صفحات ہو گئی۔ یہ ضرور ہے کہ انشاؔ نے اپنی کہانی کا نام خود کہیں نہیں لکھا لیکن لفظ کہانی اور اس کے لکھنے کا سبب اس طرح بیان کیا ہے۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی کوئی کہانی ایسی کہ جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے تب جاکر میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو" سلہ

دوسرے ایڈیشن میں دیباچہ بجنسہٖ شائع کیا گیا ہے لیکن مولوی عبدالحق مرحوم نے اس میں جو ترمیم و اضافے کئے ہیں اس کا ذکر دیباچہ طبع ثانی میں نہیں کیا البتہ اختلاف نسخ (جو حاشئے پر درج ہیں) کا ذکر دیباچہ طبع ثانی میں کیا ہے۔

انشاؔ ظریف الطبع اور آزاد مزاج تو تھے ہی کہانی میں بھی انھوں نے اسی آزادی سے جگہ جگہ کام لیا ہے۔ یہ کہانی ٹھیٹ ہندی میں ہے اور اتنی سہل اور آسان ہے کہ اس کو ہندی والا بھی سمجھتا ہے اور اردو والا بھی۔ یہ کہانی ہندوستان کی نادر مثال ہے۔ زبان نہایت صاف اور شگفتہ ہے۔ اس میں انشاؔ کی انشاء پردازی کے جوہر قدم قدم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی انشاء پردازی اور جودت طبع کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ تاڑ سکے (تا سکے) سچ ہے جو بنایا ہو سو اپنے بنانے والے کو کیا سراہے اور کیا کہے! یوں جس کا جی چاہے پڑا بکے سر سے لگا پانوں (پاؤں) تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں

سلہ کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن ص ۳

اور اتنے برسوں (برس) اسی دھیان میں رہیں جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے کرا کریں۔“

” ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے اپنے اسی اٹھکیلی (اٹکھیلی) سے اور الھڑ پن (الہڑپن) کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے (سامنے) آئی تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا ہے۔ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تب تو یہ کنور اودے بھان جو گھا (بھوکا) پیاسا اور نیند ابس تا اںگڑائیاں لیتا بکا بکا ہو کے لگا آسرا ڈھونڈھنے (ڈھونڈنے) اتنے میں کچھ امرائیاں دھیان چڑھیں ادھر چل نکلا“ [1]

یہ کہانی دوسری داستانوں کے مقابلے میں بہت مختصر ہے لیکن مختصر داستانوں میں زبان و بیان اور شوخی و ظرافت کے اعتبار سے اس کا درجہ سب سے بلند ہے بلکہ اپنی طرز کی ایک انوکھی اور انوکھی داستان ہے۔ قصے کا مختصر خلاصہ اس طرح ہے:

کسی دیش کا ایک راجا تھا۔ اس کا نام سورج بھان تھا، اس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام کنور اودے بھان تھا۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلنے کسی جنگل میں نکل گیا وہاں اسے ایک ہرنی نظر پڑی بس اس کا تعاقب کرتا ہوا راستہ بھول گیا۔ اس نے جنگل میں امرئیوں کے باغ میں چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے ہوئے دیکھا۔ ان ہی میں راجا جگت پرکاش کی حسین اور خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ یہیں کنور اودے بھان کی ملاقات رانی کیتکی سے ہوجاتی ہے۔ کیتکی کی ایک سہیلی مدن بان بھی تھی جو اس کی ہمراز تھی۔ اس نے ایک دوسرے

---

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن ص ۲، ۷

کو اپنی اپنی انگوٹھیاں بدلنے کی ترکیب بتائی جو بہت پسند کی گئی۔ کنور کیتکی کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ بالآخر جب راز کھلا تو کنور کے باپ نے شادی کا پیام کیتکی کے باپ راجا جگت پرکاش کے پاس بھیجا۔ کیتکی کا باپ شادی کے لئے رضامند نہیں ہوا۔ پھر کیا تھا دونوں راجاؤں میں لڑائی چھڑ گئی۔ کیتکی کے باپ نے جب یہ دیکھا کہ لڑائی میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس نے اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاش پہاڑ پر رہتا تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ اس نے آتے ہی اپنے علم کے زور سے کنور اودے بھان اور اس کے والدین کو ہرن بنا دیا۔ اب کیا تھا رانی کیتکی نے بھبوت آنکھوں میں لگا کر جنگلوں کی راہ لی اور اپنے ہرن کو ڈھونڈنے لگی۔ ادھر اس کی گم شدگی پر اس کے والدین کے ہوش ہرن ہو گئے۔ آخر کار راجا جگت پرکاش نے اپنی مدد کے لئے جوگی مہندر گر اور راجا اندر کو بلوایا۔ کنور اودے بھان اور اس کے والدین ہرنوں سے انسان بنا دئے گئے۔ اس کے بعد کنور اور کیتکی کی شادی بڑے دھوم دھام سے کر دی جاتی ہے۔

کہانی بالکل سیدھی سادی ہے۔ کہیں پر بھی ہیر پھیر نہیں۔ قصے کو بھی بے جا طول نہیں دیا گیا ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ کہانی میں انشا نے یہ التزام نبھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہ آنے پائے۔ سو یہ پابندی کوئی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ قصہ ہندوانی ہے اور ہندوانی زندگی اور معاشرت سے تعلق رکھتا ہے کردار بھی ہندوانی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قصے کے ہندوی پن میں جو سادگی اور سلاست انشا نے قائم رکھی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہانی میں اور بھی نکھار اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ کہانی میں جو روزمرہ کی بول چال کے محاورات استعمال کئے ہیں وہ انشا کی قادر الکلامی اور وسعت معلومات کا پتہ دیتے ہیں۔

کنور اودے بھان جب تھکا ہارا رانی کیتکی اور اس کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کسی

پیڑ کے نیچے رات بسر کرنے کے لیے پہنچتا ہے تو کیتکی اور اس کی سہیلیاں ٹھہرنے کو منع کرتی ہیں۔ اس پر کنور نے جو عاجزی اور انکساری دکھائی ہے وہ یہ ہے

"اتنی رکھائیاں نہ دیجئے۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانہ میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑ رہوں گا ..... ایک ہرنی کے پیچھے سب لوگوں کو چھوڑ کر گھوڑا پھینکا تھا جب تلک اوجیالا (اجالا) رہا اسی کے دھیان میں تھا۔ جب اندھیرا چھا گیا اور جی بہت گھبرا گیا ان امریوں کا آسرا ڈھونڈ کر یہاں چلا آیا ہوں کچھ روک ٹوک تو نہ تھی جو ماتھا ٹھنک جاتا اور رک رہتا سر اٹھائے ہانپتا ہوا چلا آیا۔" [1]

کنور کی یہ باتیں سن کر کیتکی کا جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور وہ اس کی انکساری اور میٹھے پن سے مرعوب ہو جاتی ہے اور کیتکی کو مسافر کی بے بسی پر ترس آ جاتا ہے وہ اپنی سہیلی مدن بان سے اس کے بارے میں یوں کہتی ہے۔

"نہ جی بولیاں ٹھولیاں نہ مارو۔ ان سے کہد جیاں جی چاہے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں سو انہیں پہنچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مارا نہیں۔"

جب ان منہ کا ڈول گال تمتمائے اور ہونٹ پپڑائے اور گھوڑے کا ہانپنا اور جی کا کانپنا اور گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا اور نڈھال ہو کر گر پڑنا ان کو سچا کرتا ہے۔ بات بنائی اور سچوٹی کی کوئی چھپتی ہے پر ہمارے اور ان کے بیچ میں کچھ اوٹ سی کپڑے لتے کی کر دو اتنا آسرا پا کے سب سے پرے کونے میں جو پانچ سات چھوٹے چھوٹے پودے تھے اون کی چھانہ میں کنور نے اوڑھنے بچھانے سے اپنا بچھونا کیا۔" [2]

---

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن ص ۸

[2] ″ ″ ″ ″ ص ۹

انشاء کی ذہانت اور آزاد خیالی نے کہانی میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان جب ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں تو کنور کے باپ کی طرف سے شادی کا پیام ایک بامن کے ذریعہ کیتکی کے باپ کے پاس پہنچتا ہے۔ کیتکی کا باپ اس رشتے کی خبر سن کر غصے ہو جاتا ہے۔ بالآخر دونوں راجاؤں میں اس بات پر لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ کنور اودے بھان کیتکی کو ایک خط میں بھاگ چلنے کے لئے لکھتا ہے۔ کہانی میں کیتکی کا کردار سب سے بلند اور جاندار ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی عزت کو اپنا دھرم سمجھتی ہے۔ اپنے ماں باپ کی عزت کا جتنا اسے پاس ہے اس سے کہیں زیادہ کنور کے ناراض ہونے کا بھی خیال ہے لیکن کنور کو وہ جس انداز سے سمجھاتی ہے اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے نظر آتی ہے۔ کنور کو خط میں لکھتی ہے کہ

"اے میرے جی کے گاہک، جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوؤں (کوے) کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھوں میں چین کلیجے سکھ ہو۔ پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں اس میں ایک باپ دادے کو چٹ لگ جاتی ہے اور جب تک ما (ماں) باپ جیسا کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسی ڈول سے بیٹا بیٹی کو کسی پر پٹک نہ ماریں اور سر سے کسی کے چپک نہ دیں تب تک یہ ایک جی تو کیا جو کروڑ جی جاتے رہیں تو کوئی بات نہیں تو رچتی نہیں"[1]

کیتکی کنور کو بے حد چاہتی ہے لیکن وہ جذبات کی رو میں نہیں بہتی۔ اس کے کردار میں صاف گوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کنور دمادار اور سیدھا سادا نوجوان ہے۔ اس میں پرانے زمانے کے راج کماروں کی طرح بھولا پن ہے البتہ جذبات کی رو میں بہکر کھوئے گئی پر کچھ اس کے بس کی بات نہیں۔

---

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن ص ۱۹، ۲۰

اردو کی دوسری ضخیم اور مختصر داستانوں میں فوق فطرت کی کثرت زوروں پہ پائی جاتی ہے۔ ان میں جادوگر۔ دیو اور پریاں اپنے اپنے کرتب اس انداز سے دکھاتی ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے لیکن اس داستان میں نہ جادوگر دکھائی دیتے ہیں نہ دیو اور پریاں البتہ ایک جوگی مہندر گر اور اس کے کچھ ساتھی ضرور دکھائی دیتے ہیں جو کیلاش پہاڑ پر رہتے ہیں۔ ان کے بس میں ایک ایسا بھبوت ہے جیسے آنکھ میں لگانے سے دوسرا نظر نہیں آتا۔ دوسرے آدمیوں کو ہرن بنانا وغیرہ طاقتیں ان کے بس میں ہیں۔ صرف یہی تھوڑا بہت فوق فطرت اس کہانی میں ابھر سکا ہے لیکن یہ فوق فطرت بھی اردو کی دوسری داستانوں سے بالکل الگ ہے۔ انشاء نے اس کہانی میں یہ التزام رکھا ہے کہ وہ اپنی اصل ڈگر سے قاری کو ہٹانا اور اس کو جھٹکا کر کسی اور طرف لے جانا قصہ گوئی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ کہانی کہتے کہتے قاری کے ذہن کو ماضی سے حال کی طرف اس طرح لے آتے ہیں کہ وہ ذرا بھی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا اور گذرے ہوئے واقعات اس کی آنکھوں میں اس طرح پھر جاتے ہیں جیسے وہ ماضی کے واقعات نہیں حال کے ہیں اس کہانی کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں ایسے موقع جگہ جگہ آئے ہیں لیکن انشاء نے ان کی دلکشی میں ذرا بھی فرق نہیں ہونے دیا۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

> مدن بان رانی کیتکی کو اکیلا چھوڑ کر راجا جگت پرکاش اور رانی کام لتا جس پہاڑ پر بیٹھے ہوئے تھے وہاں جھٹ سے آ دیس کر کے آکھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے لیجئے آپ کا گھر نئے سرے سے بسا اور اچھے دن آئے۔ رانی کیتکی کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا انھیں (انکھیں) کے ہاتھ کی پرچی لائی ہوں۔ آپ پڑھ لیجئے آگے جو چاہے سو کیجئے۔

انشاء نے کہانی کے درمیان میں اشعار بھی لکھے ہیں لیکن ان شعروں میں کوئی خاص بات نہیں البتہ یہ سیدھے سادے اشعار کیتکی کی دلی کیفیت کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں۔ ان شعروں میں اپنائیت کا احساس انتہائی عروج پر نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چپکے چپکے کراہتی تھی
جینا اپنا نہ چاہتی تھی
یاں پیاس کسے بھلا کسے بھوک
دیکھوں ہوں وہی ہرے ہرے روکھ
امریوں میں اون (ان) کا وہ اترنا
اور رات کا وہ سائیں سائیں کرنا
کیوں کر انھیں بھولوں کیا کروں
ما (ماں) باپ سے کب تلک ڈروں میں
یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے
ایک اوس سی مجھ پہ پڑ گئی ہے

انشاء کو زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ ان کے ذہن میں بہت سے الفاظ کا ذخیرہ محفوظ ہے اس لئے کہانی میں انھوں نے بہت سی مشکل باتوں کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں بعض ٹھیٹ ہندی الفاظ کو اپنی کہانی میں اس خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ ان کو کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا انشاء نے کہانی میں تشبیہات و استعارات بھی کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

کہانی کا آخری حصہ بڑا ہی دلکش اور دلچسپ ہے۔ اس میں انشاء کے تخیل کی بلند پروازی کا اور ہندو معاشرت کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں۔

سوز معاشرت کے سچے رنگ و روپ میں رچی ہوئی تہذیب کی تصویریں اور انشاء کا باندھا ہوا ٹھاٹ ملاحظہ ہو۔

"تین برس کا پیسا جو لوگ دیا کرتے تھے اس راجا کے راج بھر میں جس جس ڈھب سے ہوا کھیتی باڑی کراکے ہل جوت کے اور کپڑا لتا بیچ کھوچ کے سو سب ان کو چھوڑ دیا جو اپنے گھروں میں بناؤ کے ٹھاٹ کریں اور جتنے راج بھر میں کنویں (کنوئیں) تھے کھنڈ سالوں کی کھنڈ سالیں لے جا ان میں انڈیلی گئیں اور سارے بنوں میں اور پہاڑ تلیوں میں لالٹینوں کی جھم جھماہٹ راتوں کو دکھائی دینے لگی اور جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسنبھا اور ٹیسو اور ہارسنگھار پڑ گیا اور کیسر بھی تھوڑی تھوڑی گھولنے میں آگئی اور پھننگ سے لگا جڑ تلک جتنے جھاڑ جھنکاڑوں میں پتے اور پتوں کے منڈھے چھتے تھے ان پر روپہلے سنہرے ڈانک گوند لگا کے چپکا دیے اور سبھوں کو کہہ دیا گیا جو سوہی پگڑی اور سوہے بن کوئی کسی ڈول کا کسی روپ سے نہ پھرے چلے۔"[1]

انشاء نے اودے بھان کے بیاہنے کی تیاری میں کیا کیا ٹھاٹ دکھائے ہیں۔ ان کے تخیل کی رنگینی اور ان کا باندھا ہوا ٹھاٹ بھی دیکھئے۔ مصور نے کس خوبصورتی سے تصویر میں نئے نئے رنگ بھرے ہیں اور ان کو تصویر کے سجانے اور سنوارنے میں جو مہارت مصور کو صرف کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ان کیاریوں کے بیچ میں ہیرے پکھراج، ان منڈھے موتیوں کے جھاڑ اور لالٹینوں کی بھیڑ بھاڑ کی جھم جھماہٹ دکھائی دے اور

---

[1] کہانی رانی کیتکی، دوسرا ایڈیشن ص ۴۱ : ۴۲

انھیں لالٹینوں میں سے ہت پھول پھلجھڑیاں، چاہی، جوہیاں، کدم، گیند ا، چنبیلی اس ڈھب سے چھوٹے کہ دیکھنوں کی چھاتیوں کے کواڑ کھل جائیں اور پٹاخے جو اچھل اچھل کے پھوٹیں ان میں سے ہنستی سپاری اور بولتے پکھرو ے ڈھل ڈھل پڑیں اور جب تم کو ہنسی آوے تو چاہیے اس ہنسی کے ساتھ موتی کی لڑیاں سب جھڑیں جو سب کے سب ان کو چن چن کے راج راجے ہو جاویں۔ ڈومنیوں کے روپ میں سارنگیاں چھیڑ چھیڑ سوہیلے گاؤ، دونوں ہاتھ ہلاؤ، انگلیاں بجاؤ جو کسی نے نہ سنے ہوں وہ تاؤ بھاؤ آؤ جاؤ راؤ چاؤ دکھاؤ، ٹھڈیاں کپکپاؤ اور ناک بھویں تان تان بھاؤ بتاؤ کوئی چھوٹ کر نہ رہ جاؤ، ایسا بھاؤ جو لاکھوں برس میں ہوتا ہے۔ جو جو راجا اندر نے اپنے منہ سے نکالا تھا آنکھ کے جھپک کے ساتھ وہی ہونے لگا اور جو کچھ ان دونوں مہاراجوں نے ادھر اُدھر کہہ دیا تھا سب کچھ اسی روپ سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"[1]

کہانی کے آخری حصے نے ان رنگینیوں کو اور بڑھا دیا ہے۔ اتنی مختصر سی داستان میں جہاں یہ سب خوبیاں ہوں اسے ہم کامیاب داستان کہہ سکتے ہیں۔ ویسے یہ کہانی کچھ نہیں محض زبان کی خوبی اور چیزوں کے بیان کرنے کا انداز ہے جو ایک لولی پلاٹ پر سونے کا ملمع چڑھا دیتا ہے البتہ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندو معاشرت کی جیتی جاگتی تصویروں کو انشا نے جن مختلف رنگوں سے سنوارا اور آراستہ کیا ہے وہ یقیناً ان کے تخیل اور مشاہدے کی رہین منت ہے۔

---

[1] کہانی رانی کیتکی دوسرا ایڈیشن ص ۴۹

کیتکی کے باپ نے منہ دکھائی میں بیٹی کو کافی زر اور ساز و سامان دیا۔ اس کے علاوہ جوگی کے کہنے سے ان لوگوں کو بھی کافی سامان دیا جنہوں نے اس بیاہ میں رات دن کام کیا تھا۔ راجہ کی فراخدلی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔ کہانی کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

"جوگی نے یہ سبھوں سے کہدیا جو لوگ ان کے بیاہ میں جاگے ہیں ان کے گھروں میں چالیس دن رات مڈیوں کے روپ میں ہن برسیں اور جب تک جئیں پھر کسی بات کو نہ ترسیں۔ نو لاکھ ننانوے گائیں سونے روپے کی سنگھوٹیوں کی جڑا ڈ گہنا پہنے ہوئے، گھنگرو، جھنجھناتیاں باجھنوں کو دان ہوئیں اور سات برس کا پیسا سارے راج کو چھوڑ دیا۔ بائیس سے ہاتھی اور چھتیس سے اونٹ لدے ہوئے روپوں کے لٹا دئے۔ کوئی اس بھیڑ بھاڑ میں دونوں راج کا رہنے والا ایسا نہ رہا جس کو گھوڑا جوڑا روپوں کا توڑا سونے کی جڑاؤ کڑوں کی جوڑی نہ ملی ہو"

عبارت کی سادگی اس داستان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ راجا اندر نے دلہن کی منہ دکھائی میں اور جوگی کے کہنے پر بیاہ میں کام کرنے والوں کو جو چیزیں دی ہیں ان کو پڑھ کر دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ انشاء کی اس کہانی میں ہند و معاشرت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں اپنے اصل رنگ میں نظر آتی ہیں۔ مصنف نے قصے کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس میں عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ کرکے ہندوستانی کی ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہی خوبی اس کی شہرت کی سب سے بڑی ضمانت ہے اور انشاء کا یہ کارنامہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

باغ و بہار

میر امن نے اپنے نسخے کو ۱۲۱۷ھ کے ابتدا میں مکمل کیا تھا جیسا کہ ان کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھی سن بارہ سو سترہ در شمار

مولوی عبدالحق اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "اس کی مقبولیت کا بہت بڑا راز اس کی فصاحت و سلاست میں ہے" اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے۔ اصل میں "باغ و بہار" کی مقبولیت اس کی فصاحت و سلاست ہی میں مضمر ہے مگر جہاں تک اس قصے کے اصل مصنف کا تعلق ہے مولوی صاحب سراغ لگانے سے قاصر ہیں۔ یہ قصہ امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کا کوئی مکمل ثبوت نہیں۔ خسرو کی تصانیف میں بھی اس کا دور دور پتہ نہیں۔ مقدمے کے زیادہ تر حصے میں مولوی صاحب نے کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ درحقیقت میر امن نے "باغ و بہار" کا براہ راست فارسی سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس کا ماخذ اردو کی کتاب "نوطرز مرصع" ہے۔ اصل یہ ہے کہ ترجمہ ان دو میں سے کوئی نہیں۔ فارسی داستان کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ میر امن نے "نوطرز مرصع" کو اپنا انداز بیان عطا کیا اور بڑی خوبی سے اپنایا۔ "نوطرز مرصع" کی گمنامی کا اصل سبب اس کی ثقیل اور

بے جان عبارت ہے۔ قصہ "باغ و بہار" میں وہی ہے مگر طرزِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے
"نو طرزِ مرصع" دو اشخاص نے لکھی ہے۔ ایک میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ اور
دوسرے محمد عوض زریںؔ اس کے مصنف ہیں تحسینؔ کی نو طرزِ مرصع' سے میر امنؔ نے مدد
لی اور باغ و بہار، جس سال تصنیف ہوئی اسی سال زریںؔ نے "نو طرزِ مرصع" کے نام سے
اسی چہار درویش کو آسان اردو میں لکھا۔ لیکن میر امنؔ اور زریںؔ کے اندازِ بیان میں
بہت فرق ہے۔ میر امن کہانی کی فضا پیدا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں لیکن زریںؔ
داستان گوئی کے اس گر سے بالکل واقف نہیں۔ ان دونوں کے فرق ملاحظہ ہوں۔
زریںؔ لکھتے ہیں۔

"ایک روز باد تند تھی۔ شہر سے باہر ایک چراغ نظر آیا۔ فرمایا اس
شدت ہوا میں چراغ روشن کرشمۂ جنات ہے یا کسی بزرگ کی
کرامات ہے۔ قدم آگے رکھا۔ دیکھا ایک مقبرے میں چار فقیر درویش
خاموش بیٹھے ہیں۔ پوشیدہ کھڑا ہو تا دریافت کرے انسان ہیں
یا شیطان ناگاہ ایک فقیر بولا ہم تم ہر ایک نے بہت سا رنج اٹھایا
اور آج آب و دانہ یہاں لایا۔ کل دیکھئے پردۂ غیب سے کیا باہر
آئے اور یہ چرخ شعبدہ باز کیا بازی لائے۔ شب دراز ہے
اور درد دل جاں گداز ہے۔ اپنی اپنی سرگذشت کہو تا روز روشن
ہو۔ کہا بہتر ہے۔"

باغ و بہار میں میر امنؔ نے اس کو اس طرح لکھا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ اس وقت باد تند چل رہی تھی۔ بلکہ آندھی کہا چاہیئے
اکبارگی باد شاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے
تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور

اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں۔ یا یہ طلسم ہے کہ اگر بھگری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے آس پاس چھڑک دیجیے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا۔ یا کسی ولی کا چراغ ہے کہ جلتا ہے۔ جو کچھ ہو سو ہو چل کر دیکھا چاہیئے۔ شاید اس شمع کے نور سے میرے گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کو مراد ملے۔ یہ نیت کر کے اس طرف کو چلے جب نزدیک پہنچے دیکھا تو چار فقیر بے نوا کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے عالم بیہوشی میں خاموش بیٹھے ہیں۔"

ان دونوں اقتباسات کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کا فرق ہے۔ نہیں کی عبارت کو پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ اپنی بات جلد ختم کر رہا تاکہ آگے قاری کو پڑھنے کی زحمت نہ ہو۔ میرامن کے یہاں یہ بات نہیں۔ میرامن کی عبارت کو پڑھتے وقت قاری کو بہت سی دلچسپ باتیں ملتی ہیں جس سے وہ اکتا تا نہیں۔ ان کی عبارت کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ قاری کو آگے پڑھنے کی جستجو رہتی ہے۔ میرامن واقعہ کی فضا پیدا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ نہیں کو فضا پیدا کرنے کا سرے سے خیال ہی نہیں رہتا۔ میرامن کے کردار محض کٹ پتلی کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا خاص ماحول ہوتا ہے اور یہ اسی ماحول میں سوچتے اور کام کرتے ہیں۔ ان دونوں میں ایک یکسانیت ہے اور وہ یہ کہ زبان آسان اور سہیل استعمال کی ہے۔ البتہ میرامن نہیں سے دو قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمے میں ان محاوروں اور الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے مگر جہاں تک ان کے اس خیال کا تعلق ہے اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے۔

نقوش لکھے ہیں - ایک انگریز شاعر کا قول ہے کہ "ماضی کو اپنے مردے دفنانے دو" جو الفاظ زمانے کی گردش سے متروک ہو چکے ہیں وہ مشکل ہی سے زندہ ہوتے ہیں - درحقیقت زبان کو ان کی ضرورت بھی نہیں ہوتی -

میرامن نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ یہ قصہ ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا زری زر بخش کی بیماری کے زمانے میں ان کا دل بہلانے کے لیے کہا تھا - میرامن لکھتے ہیں -

"ان کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے - اللہ نے چند روز میں شفا دی - تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا - جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں نہ تھا اس کا ماخذ ہندی یا عربی ہے ممکن ہے یہ امیر خسرو کی اختراع ہو کہ انھوں نے چند قصوں کی آمیزش سے ایک نئی داستان تیار کر دی مگر وہ اس کے مصنف نہیں کہے جا سکتے - اس کے بعد میرامن اردو کی نشو و نما پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی زبان کو سند کہلواتے ہیں اور اردو کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے - ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں میں ہندو مسلمان کی آمیزش

پائی آخر امیر تیمور سے ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار اردو کہلایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تلک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔"

اس لحاظ سے میرامن سب سے پہلے شخص ہیں جو اردو کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کو اردو زبان سے بے حد دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ ان کا مقدمہ بے حد دلچسپ ہے۔

داستان کے آغاز میں میرامن نے جس خوبی سے ایک پراسرار فضا پیدا کی ہے وہ داد کی مستحق ہے۔ اسی مقام کو "نوطرز مرصع" میں اس طرح بیان کیا ہے

"اس عرصے میں فرخندہ سیر کے تئیں دور سے بہ فاصلہ فرسنگ کے ایک چراغ نظر آیا لیکن باوصف استبداد باد صرصر کے زنہار اشتعالہ، چراغ کے تئیں سر مو حرکت نہ تھی"۔

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت بالکل بے اثر اور بے ربط ہے "تئیں" کا لفظ اتنی جلدی دہرایا گیا ہے کہ قاری کے دماغ پر بار گزرتا ہے۔ اس کے برخلاف میرامن اسے اس انداز سے لکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کو جستجو ہونے لگتی ہے کہ آگے کیا ہوا۔ لکھتے ہیں۔

"جاتے جاتے ایک گورستان میں پہنچے۔ نہایت صدق دل سے درود پڑھ رہے تھے اور اس وقت باد تند چل رہی تھی بلکہ آندھی کہا چاہیئے ایک بارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ مانند صبح کے تارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ اس آندھی اور

اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں ۔۔۔۔۔ دیکھا تو چار فقیر کفنیاں
گلے میں ڈالے اور سر زانوں پہ دھرے عالم بے ہوشی میں خاموش بیٹھے
ہیں اور ان کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے بچھڑ
کر بے کسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہ جاتا ہے “

اس سے پہلے نو طرز مرصع کی اس عبارت کا میر امن سے مقابلہ کیا جا چکا ہے
اب تحسین کی یہی عبارت میر امن سے کتنی مختلف ہے۔ تحسین کے یہاں انداز بیان نہایت
فرسودہ اور دھندلا ہے۔ میر امن اسی بات کو سہل اور آسان زبان میں اس طرح بیان
کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو فرحت محسوس ہوتی ہے۔ تحسین کی عبارت دماغ پر بار گزرتا
ہے مگر میر امن بات کہنے کے ساتھ ساتھ اختصار کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اسی
اختصار میں دل کشی پیدا کرنے میں ان کو بے پناہ مہارت ہے۔ باغ و بہار کے
اسلوب میں سادگی اور سلاست کے ساتھ روانی اور فصاحت بھی ہے۔ میر امن
پہلے درویش کی سیر میں لکھتے ہیں

”چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے کچھ اندیشہ
دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی
سے مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ اک
بارگی یتیم ہو گیا کوئی سر پہ بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی
سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس
دن جوں توں کر کے کٹے چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے
جمع ہوئے جب فاتحہ سے فراغت ہو لی۔ سب نے فقیر کو
باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے ماں باپ
مرتے آئے ہیں۔ اور اپنے تئیں بھی ایک دن مرنا ہے۔ بس صبر کرو۔

اپنے گھر کو دیکھو"۔

میر امن کے اس بیان میں کس قدر سادگی اور سلاست ہے۔ اختصار بھی قابل توجہ ہے۔ یہ ایک اچھے داستان گو کے لیے بے حد ضروری ہے۔ والدین قضائے الٰہی سے مر گئے اس بات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ لیکن یہ بات کہنا اس کی علامت ہے کہ اس کے آگے کیا ہونے والا ہے۔ لوگوں کی ہمدردی اور اپنی عیش کوشیوں کا ذکر ذرا تفصیل سے اس لیئے کیا ہے کہ اس کے بغیر قصہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

تحسین اور زریں کا میر امن کے انداز بیان سے مقابلہ کیا جا چکا ہے ان دونوں میں میر امن کے انداز بیان میں سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ فصاحت ہے اور ایک خاص خوبی قصے کا اختصار ہے جو قاری کے دماغ پر ذرا بھی بوجھ نہیں ڈالتا۔ "باغ و بہار" میں چار درویشوں کے قصے ہیں لیکن ایک طویل قصہ خواجہ سگ پرست کا ہے جو آزاد بخت بادشاہ کی زبان سے بیان ہوا ہے۔ اس طرح "باغ و بہار" میں کل پانچ طویل قصے ہیں۔ درمیان میں ضمنی قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو ان کے علاوہ ہیں

پہلے درویش کی سیر میں دمشق کے سلطان کی بیٹی جو نہایت خوبصورت تھی بڑی نازوں کی پلی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اس کی دیکھ بھال کے لئے نوکرانیاں ہر وقت موجود رہتیں غرض اس کو کسی بات کی فکر نہ تھی۔ ایک روز اس کی طبیعت ایسی بے مزہ ہوئی کہ کوئی چیز اچھی نہ لگتی۔ اس کا ایک ہم راز خواجہ سرا تھا۔ شاہزادی اس پر بھروسہ کرتی تھی۔ خواجہ سرا نے جب شاہزادی کی یہ حالت دیکھی تو اس کو شربت ورق الخیال پلانے کی ترغیب دی اور کہا کہ اس کے پینے سے طبیعت میں شگفتگی اور پھرتی پیدا ہو گی چنانچہ حکم ہوا کہ شربت ایک صراحی میں جس میں برف بھی ہو پیش کیا جائے۔ خواجہ سرا بڑا موقع شناس تھا

اس نے ایک لڑکے کو جو خوب رو تھا اس کام کے لیے معمور کیا کہ وہ ہر روز اہتمام
کے ساتھ شربت شاہزادی کو پلایا کرے۔ شاہزادی کو شربت بہت پسند آیا۔
اب ہر روز وہی لڑکا شربت لاکر شاہزادی کو پلاتا اور انعام و اکرام پاتا۔ شاہزادی
شربت کو پی کر اس لڑکے سے اٹھکھیلیاں کرنے لگی یہاں تک کہ لڑکا بھی
سسکیاں لینے لگا۔ یہیں سے دونوں کے دلوں میں گدگی پیدا ہوتی ہے۔ اب
اس کا کچھ حال شاہزادی کی زبان سے سنئے :-

"اس دن یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا مرادی اسی چھوکرے کے ہاتھ لوا آوے
اور بندی پیا جاوے، جب اس کا نشہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں
اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کر دل بہلاتی تھی، وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا
تب اچھی اچھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور اچنبھے کی نقلیں لانے بلکہ آہ ادبی
بھی بھرنے، اور سسکیاں لینے۔ صورت تو اس کی طرح دار لائق
دیکھنے کے تھی، بے اختیار جی چاہنے لگا۔ میں دل کے شوق سے اور
اٹھکھیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخش دینے لگی، پر وہ کم بخت
انہیں کپڑوں سے جیسے ہمیشہ پہن رہا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی
میلا کچیلا ہو جاتا تھا۔"[1]

اس سے شاہزادی کے جذبات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ لڑکے
کو شاہزادی جو انعام و اکرام سے نوازتی وہ سب استاد لے لیتا کپڑے لتے
کہاں سے بناتا۔ لڑکے نے شاہزادی کے پوچھنے پر صاف صاف کہہ دیا کہ "جو کچھ
آپ نے اس غلام کو عنایت کیا سب استاد نے لے لیا، مجھے ایک پیسہ نہیں
دیا۔ کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں۔" شاہزادی

[1] باغ و بہار ص ۵۴

کو لڑکے کی اس صاف گوئی پر ترس آیا اور اس نے خواجہ سرا کو لڑکے کی تربیت کا حکم دیا لڑکے کے بیان میں کتنی سادگی اور بھولا پن ہے۔ اس کے اسی انداز نے شاہزادی کے دل پر آہستہ آہستہ قابو پالیا۔ شاہزادی کے دل میں غریبوں کی طرف سے جو ہمدردی ہے وہ ظاہر ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لڑکے کا رنگ و روغن نکھر آیا۔ اب ذرا شاہزادی کے دلی جذبات اسی کی زبان سے سنیے! اس میں کتنی اپنائیت اور محبت کا رنگ کس حد تک غالب نظر آتا ہے۔

"میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کافر کی صورت جی میں ایسی کھپ گئی تھی یہی جی چاہتا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔ آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا اور خلعتیں طرح بہ طرح کی اور جواہر رنگ برنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سکھ کلیجے کو ٹھنڈک ہوتی۔ ہر دم اس کی خاطرداری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا اور کئی برس کے بعد وہ بالغ ہوا۔ مسیں بھیگنے لگیں"۔[1]

شاہزادی کی بے چینی قابل غور ہے۔ وہ لڑکے کی خاطر تواضع کا ہر وقت خیال رکھتی۔ لڑکا کم سن تھا اس لئے اس کی ہر ادا اس کو بے حد پسند تھی اس سے شاہزادی کے دل کی کیفیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بالغ ہونے کے بعد جب لڑکے کا محل میں آنا بند ہو گیا تو شاہزادی کی بے قراری اور بدحواسی بڑھ گئی چونکہ اس کی غیر موجودگی اس کو منظور نہ تھی اس لئے شاہزادی نے اس کے لئے جوہری کی دوکان کھلوا دی تاکہ تجارت میں اپنی زندگی فراغت سے بسر کر سکے [illegible] حویلی اپنے محل کے برابر بنوائی۔

---

[1] باغ و بہار ص ۵۵

غرض یہ کہ ہر طرح کا آرام اس لڑکے کے رہنے کو دیا۔ تجارت میں ایسی ترقی ہوئی کہ جوہری کی دوکان پر دور دراز ملکوں سے گاہک خرید و فروخت کے لیے آتے۔ یہاں تک کہ اس شہر میں اس کے مقابلے کا کوئی جوہری نہ تھا۔ اس کاروبار میں اس نے لاکھوں روپے کمائے اور نام پیدا کیا۔ شاہزادی نے لڑکے کو اپنایا اور اس کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ ایک دفعہ اس کی فرمائش پر ایک باغ اور ایک لونڈی پانچ لاکھ پانچ ہزار میں خرید کر جوان کے حوالے کی۔ اتفاق سے ایک روز شاہزادی سیر کی غرض سے اس باغ کی طرف جا نکلی دیکھا وہ جوان لونڈی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ مگر اس جوان کی وجہ سے وہ خاموش رہی۔ جوان نے جب بے حیائی کی باتیں اس لونڈی سے کیں اس پر شاہزادی کو بڑا غصہ آیا مگر اس نے یہاں ضبط سے کام لیا اور اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ جوان کو شاہزادی کی موجودگی شاق گزری۔ اس نے مصنوعی طور پر شاہزادی کو منایا۔ اس کو خوب شراب پلائی۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی اسی بے ہوشی میں جوان نے اس کو زخمی کیا اور صندوق میں ڈالکر قلعہ کی دیوار پر لٹکا دیا۔ شاہزادی کی محبت کا انجام بڑا دردناک ہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ آج کا یہ کم سن کل جوان ہو کر ایسی نازیبا حرکت کرے گا۔ شاہزادی نے اپنی محبت کی خاطر جوان کی ہر خواہش کو پورا کیا اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کی مگر جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ برے فعلوں میں پڑ گیا۔ باغ کے خریدنے کا تو ایک بہانہ تھا اصل میں تو لونڈی کا حاصل کرنا اس کا مقصد تھا جس کی قیمت بھی باغ کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ شاہزادی محبت کے آگے مجبور تھی بے بس تھی یہ سب کچھ اس نے اس کے بھولے پن کی وجہ سے کیا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ بھولے میں بھنگا نکلے گا۔ شاہزادی کا محبت بھرا یہ جملہ کہ "یہی جی چاہتا ہے کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں" اس کے

دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں کتنا رس اور مٹھاس ہے۔ لڑکے کی شکل و
صورت شاہزادی کو ایسی بھائی کہ اپنی آنکھوں سے ایک پل کے لئے جدا نہ کرتی۔ اس
میں شاہزادی نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ محبت کی یہی شدت اس کے
لئے بدنامی کا باعث بنی۔

"باغ و بہار" میں کردار بڑے جاندار اور جاذب نظر ہیں۔ وقار عظیم صاحب
نے اپنی کتاب "ہماری داستانیں" میں میر امن کی کردار نگاری کے بارے میں بڑے
پتے کی بات کہی ہے کہ "میر امن کی کردار نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ
وہ اپنے خاص کرداروں کو جس طرح خود جانتے ہیں، چاہتے ہیں کہ دوسرا بھی جلدی سے
جلدی جان لے۔" پہلا درویش عیش سب کچھ اپنا دوستوں کی نذر کر چکا اور غربت یہاں
تک پہنچی کہ کھانے پینے تک کو کچھ باقی نہ رہا تو اسے اپنی بہن یاد آئی۔ یہ وہ بہن ہے جسے
ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھا۔ عیش و عشرت نے
اسے اس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ بہن کو دو سطروں کا خط بھی لکھ سکے۔ اب ایک
بارگی اس کی یہ درگت بنی اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے نظر آئے تو بہن کے
سوا کوئی مددگار اسے نظر نہ آیا۔ اپنے بھائی کے الفاظ میر امن کی زبان سے سنئے:۔

"اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے
کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا برقع منھ
پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی
کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا
بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے
ان کا بھی جواب اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے
جی تو نہ چاہتا تھا پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا

جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں
کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماجائی میرا
یہ حال دیکھ کر بلائیں لی اور گلے مل کر بہت روئی تیل ماش اور کالے ٹکے
مجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا
لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔
آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے خاصی پوشاک سلوا کر
حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت
اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت لوزیات
حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل
پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ تحفہ
مزیدار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطرداری کرتی
میں نے ویسی تصدیعوں کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار
ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اسی فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس
خلوت سے باہر نہ رکھا"۔[۵]

مصیبتوں میں انسان اپنے ان سہاروں کی تلاش کرتا ہے جن سے
اسے امید ہوتی ہے۔ مگر تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایسے موقعوں
پر وہ سہارے کبھی کام نہیں آتے۔ دوست آشنا سب ہی کنارہ کش ہو جاتے
ہیں البتہ مصیبتوں میں ایسے لوگ، جن میں خلوص اور سچائی ہوتی ہے اور جنہیں
بناوٹ سے نفرت ہوتی ہے کام آ جاتے ہیں۔ اس عبارت کے پڑھنے سے
اندازہ ہوتا ہے کہ بھیا کی بے رخی کے باوجود بہن سے بھیا کی حالت دیکھی نہ گئی

۵۔ باغ و بہار، ص ۲۴، ۲۵

تو پوچھا کہ "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی" اس نے بہن کی ہمدردی اور بھیا کی خستہ حالت کو دیکھ کر اس نے جتنا رنج کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بھیا نے بہن کے یہاں کئی مہینے بڑے آرام سے گزارے۔ میرامن کو اپنے کرداروں سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں پہلا درویش اپنا سب کچھ لٹا کر بہن کے ٹکڑوں پر آن پڑا اور کئی مہینے فراغت سے گزارے تو ایک روز بہن اپنے بھیا سے یوں کہنے لگی۔

تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا ان کا لازم نہیں، جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے کہ اپنے باپ کی دولت کھو کھا کے بہنوئی کے ٹکڑوں پہ آپڑا ا؎

بہن کو اپنے ماں باپ کی عزت کا کتنا خیال ہے وہ بھیا کو کتنے اچھے انداز میں نصیحت کرتی ہے اس سے نہ صرف معاشرتی زندگی کا وہ پہلو بھی سامنے آجاتا ہے جس سے بھیا کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ میرامن کے نسوانی کردار بڑے زبان دار ہوتے ہیں۔ ان کے انداز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جس بات کو خود نہیں کہہ سکتے اپنے کردار سے کہلواتے ہیں۔ کردار کے اس بیان میں صداقت ہوتی ہے اور بیان کرنے کا انداز بھی نیا ہوتا ہے دوسرے درویش کی سیر میں شہزادی کا ذکر ہے اور یہی شاہزادی اس کی بھائی کی رہبر بنتی ہے۔ تیسرے درویش کی سیر میں درویش ملکہ کو دیکھ کر

ا؎ باغ و بہار ص ۲۵

ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ملکہ اسے گلے سے لگاتی ہے اور اسے بھاگ چلنے کا مشورہ یوں دیتی ہے۔

"خوش طالعی سے یہ دن میسّر ہوا، میں نے قدم بوس کیا۔ انھوں نے میرا سر اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا اور بولیں کہ اس فرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان مجھے یہاں سے لے نکل، کسو اور ملک کو چل"۔[1]

اس کہانی کو پڑھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ملکہ کو اپنی اپنے ماں باپ اور خاندان کی عزت کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔ وہ جذبات کی رو میں اس تیزی سے بہتی ہے کہ درویش کو دیکھتے ہی بھاگ چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اتنی جلدی بھاگ چلنے کے لیے کہنا قاری کے دل میں شبہ پیدا کرتا ہے۔ ملکہ پیدل چلنے کی عادی نہیں لیکن درویش کے ساتھ یہ تکلیف بھی گوارا کرتی ہے اور پیدل اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس کہانی میں میرامن نے بے جا طول بہت دیا ہے۔ جسے پڑھ کر دکھ ہوتا ہے۔ یہاں میرامن اپنے فن کو بھول کر کچھ خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ چوتھے درویش کی سیر میں تیسرے درویش کی تقلید کا عکس نظر آتا ہے۔

میرامن کو اپنی زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے کہانی میں جن رسم و رواج اور ساز و سامان کا ذکر کیا ہے وہ اپنے ہی ملک کے ہیں۔ حالانکہ کہانی میں قصے روم و شام اور چین و ایران کے ہیں لکھتے ہیں:

"ازبسکہ جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا وہ لڑکی اپنی گڑیوں میں کھیلتی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا اور ڈھولک کھاو رچ

---

[1] باغ و بہار ص ۲۲۵

لئے ہوئے رنجگے کی بیاری کا گمر رہی تھی اور کڑھائی چڑھا کر گلگلے اور رحم تلتی اور بنا رہی تھی کہ ایک بارگی اسکی ماں روتی پیٹی سر کھلے پانوں ننگے مینی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پہ ماری اور کہنے لگی کہ کاش تیرے بدلے خدا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔"

اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بہت سی باتیں اور چیزیں ایسی بھی ہیں جو اب بھی بولی جاتی ہیں یا جن کا استعمال اب متروک ہو چکا ہے۔ ڈھولک رنجگے اور گلگلے وغیرہ اب بھی بولے جاتے ہیں۔

میر امن کے یہاں تصنع کا دور دور پتہ نہیں ان کی کہانیوں (قصہ چہار درویش) میں زندگی کی صحیح جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا مشاہدہ بڑا عمیق جذبات نگاری کی باریکی سے پاک اور زندگی کی حرارتوں سے مملو ہے۔ ان کے یہاں زبان کی سلاست اور سادگی کا ایسا جادو موجود ہے جسے پڑھنے کو بار بار جی چاہتا ہے۔ بیان کی دلکشی، روزمرہ محاوروں کی بوچھاڑ اور رفتار کی دلفریبی قدم قدم پر میر امن کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے "باغ و بہار" کو جتنا سہل اور آسان اردو میں لکھا اس کے بعد بہت سے قصے کہانیاں لکھی گئیں مگر ان کا انداز کوئی نہیں اپنا سکا اور نہ انہی شہرت کسی کو نصیب ہوئی حالانکہ "باغ و بہار" میں تذکیر و تانیث کا اختلاف بھی ہے اور قواعد زبان کی پابندی کا بھی میر امن نے خیال نہیں رکھا۔ بہر حال "باغ و بہار" پند و نصائح کا مجموعہ بھی ہے جس میں قصوں کے انداز میں نصیحت کرنے کے جو طریقے میر امن نے اختراع کئے ہیں، اس سے داستان میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

باغِ عشق

اُردو کی ایک غیر مطبوعہ داستان

اردو کی قدیم داستانیں زیادہ تر چھپ چکی ہیں لیکن بعض داستانیں ایسی بھی موجود ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ ان ہی میں ایک داستان "باغِ عشق" ہے۔ یہ داستان عبدالرحمٰن جامی کی مشہور فارسی کتاب لیلیٰ مجنوں کا اردو ترجمہ ہے۔ جامی کے اس منظوم قصّے کو بینی نرائن جہاں نے نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔ اردو ادب میں اس داستان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ارباب نثر اردو (سید محمد ایم۔ اے)، گل کرسٹ اور اس کا عہد (عتیق صدیقی) اور بنگال کا اردو ادب (پروفیسر جاوید نہالی) میں بھی اس داستان کا کہیں ذکر موجود نہیں۔ جہاں نے قصے کو نظم سے نثر میں ترجمہ کر کے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ ان کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ داستان کا یہ قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ آغاز:

کروں حمد اس خالقِ دو جہاں کی
کہ ہے پرورش اس سے سب انس و جاں کی

اسی کا ہے جلوا ہویدا ہے سب میں
اسی سے ہے رونق زمیں آسماں کی

عطا کر مجھے حق تو اپنے کرم سے
کلید در دولت جاوداں کی

کہوں ایک قصہ نہایت عجائب
ترے فضل سے ہووے طاقت بیاں کی

اختتام:

"اس ہیچمدان نے قصہ لیلیٰ اور مجنوں کو جو بیچ کتاب پنج گنج جامی سے ہے خوب سا بر کو حرفاً حرفاً اپنی عقل کے موافق ترجمہ کیا اور کوئی دقیقہ فرو گذاشت کرنے

میں نہیں آیا اور اشعار مضامین موقع سے جا بجا درج کیے اور موافق استعداد معدود کے عبارت کو رنگین کیا۔ آئندہ چشم داشت اس حکیم علی الاطلاق سے یہ ہے کہ تصدق سے اس جناب پاک کے یہ قصہ خوب رواج پاوے اور پسند نظر خاص و عام ہووے۔ سبب تالیف اس کہانی دلاویز کا صرف یادگاری اپنی ہی ہے اور کسی سے امید صلے کی نہیں جو کوئی اس قصے دلاویز کی سیر کرے اور ملاحظہ فرماوے محظوظ ہو کر اس عاجز کے حق میں دعا کرے تو وہ بھی فیضان الٰہی سے آفات زمانہ سے محفوظ رہ کر خوش و خرم رہے آمین رب العالمین تمام شد قصہ لیلیٰ و مجنوں بتاریخ ہشتم ماہ بھادوں ۱۲۳۹ بنگلہ الراقم مصنف۔"

حمد کے بعد جہاںؔ نے نعت نثر و نظم دونوں میں لکھی ہے نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

محمد دوست ہے ذات خدا کا　　　　کہ ہے باعث وہی روز جزا کا

نہیں ہے مغفرت اس بن کسی کی　　　　اطاعت ہے تجھے لازم اسی کی

نعت کے بعد جہاںؔ نے اپنے مختصر حالات لکھے ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنا آبائی وطن دہلی اور جدی وطن لاہور بتایا ہے۔ جہاںؔ کے بڑے بھائی کا نام کیسم نرائن تھا جو نواب وزیر سعادت علی خاں کی طرف سے بحیثیت وکیل مع کلکتہ لارڈ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ہندوستان بھیجے گئے تھے یہیں جہاںؔ بھی بھائی کے ساتھ دو سال رہے۔ یہاں رہ کر انھوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔

جہاںؔ نے اپنے حالات خود اس داستان میں اس طرح لکھے ہیں

"یہ ذرۂ بے مقدار بینی نرائن ابن راجہ سو وشنت نرائن نبیرۂ مہاراجہ بھنی نواگن قوم کھتری متوطن دلی کا رہنے والا احوال پر ملال اپنا بیان کرتا ہے۔"

اگرچہ مولد اس خاکسار کا شاہ جہاں آباد ہے پہ بزرگوار اس ہیچ ضعیف
کے عہد دولت میں جنت آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی مرحوم و
مغفور کے دار السلطنت لاہور سے ہندوستان میں آئے اور تفضلات
شاہی سے مرتبہ عالی کو پہنچے۔ اس بے بضاعت نے بھی چند سے
اوقات اپنی وہیں صرف کی اور ہوش سنبھالا جس عین میں جناب لارڈ
صاحب مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر نے شہر لکھنؤ سے کلکتے کو
مغاودت فرمائی۔

برادر صاحب و قبلہ خداوند نعمت رائے دھیم نرائن صاحب مدظلہ
العالی بعہدہ وکالت وزیر الممالک ہندوستان نواب سعادت علی
خاں بہادر مغفور ہمراہی میں جناب لارڈ صاحب ممدوح کے کلکتے میں
تشریف لائے جو یہ ہیچمدان بھی پرورش یافتہ اور تعلیم شدہ اسی
جناب بزرگ کا ہے۔ رکاب سعادت میں بھائی صاحب خداوند
کی اس شہر لطائف بحر میں وارد ہوا۔ بالفعل جناب برادر مدظلہ مسند
حیات پر موجود ہیں اور اسی شہر میں تشریف فرما ہیں۔ پچیس برس کے عرصے
میں اس ہیچ ضعیف نے اپنے دل بہلانے کے واسطے کئی نسخے تصنیف
و تالیف کر کے حضور میں صاحبان کالج کونسل کے گذرانے۔ حق
سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کتابوں نے شہر میں خوب رواج پایا
اور مرغوب مزاج خاص و عام ہوئیں بلکہ نقلیات ان کی بہت شخص
بطریق تحفہ ملک بملک لے گئے اور شہر میں بھی خوب رواج پایا نظم

کیا تھا چار گلشن پہلے تحریر
صلے سے اس کے پائی میں نے توقیر
پھر اس کے بعد قصہ اور لکھا
بہار عشق اس کا نام رکھا

کہی ہندی میں پھر یوسف زلیخا — لقب گلزار حسن اس کا رکھا تھا
تلاش دستی پھر کر کے فراداں — جو ہیں اس عصر میں باہم سخنداں
انھوں کے نسخے غزل اور شعر لکھے — یہ ترتیب دیہ اپنی جمع کر کے
خدا کے فضل سے دے اس کو انجام — میں نے دیوان چھپاں اس کا رکھا نام
کہی جب گل صنوبر کی کہانی — کری دل کھول کر بیت درفشانی
دعا پہ ختم کر بیٹھی نرائن . . — کہ مستحسن سخنور کو ہے یہ فن
رہے جب تک کہ طرز نظم یارب — پسند اس کو کریں اہل سخن سب

اور اب، کہ ایک ہزار و بیس دچار عیسوی اور بارہ سے ملبوسی ہیں ایک دن اس خاکسار کے گوش زد ہوا کہ قصہ لیلیٰ و مجنوں جو مولانا عبدالرحمن جامی رحمتہ اللہ علیہ نے فارسی زبان سے نظم میں تصنیف کیا تھا ہر چند کہ وہ قصہ سماعت میں شہرۂ کمال رکھتا ہے اور فی الحقیقت چنداں لطف نہیں رکھتا۔ ظاہر کسی شخص نے اس قصے کو فارسی زبان ریختہ ہندی میں ترجمہ کیا ہے لیکن اب تک دیکھنے میں کسی کے نہیں آیا صرف نام ہی سنا جاتا ہے۔ اس ہیچمدان نے دل میں خیال کیا افسوس ہے کہ ایسا قصہ لطیف و نادر یوں معطل و بیکار پڑا رہے اور کوئی اس کے پڑھنے اور سننے سے فائدہ نہ اٹھاوے۔ ہر چند کہ یہ بے بضاعت چنداں سلیقہ اور شعور نہیں رکھتا . . . . اس جز ضعیف نے قصہ نادر لطیف کو فارسی سے زبان ریختہ ہندی اردوئے معلیٰ میں ترجمہ کیا ہر چند کہ یہ قصہ طویل نہیں لیکن اس مولف نے عبارت کی درازی کے واسطے بہت سا خون جگر کھایا فقرۂ قلیل کو کس طرح درازی بخشنے۔ سامعوں کی جناب میں یہ عرض رکھتا ہے کہ اس کی ممبر سے محظوظ ہو کر اس سور ضعیف کو بدعا یاد کریں اور اس نذر حقیر کو نظر قبول سے سرفراز فرماویں اور یہ بدی یاد نہ کریں کس واسطے کہ انسان سہو

خطا سے بھرا ہے"[1]

اس کے بعد "باغ عشق" کی تعریف میں یہ اشعار درج ہیں۔

الٰہی جو کہ اس نسخے کو دیکھے ۔۔۔ دعا دے مجکو اور تحسین بھیجے

ھرا پا[2] اپنی اوقات اس میں کی صرف ۔۔۔ تب ایسے آب دار و خوش لکھے حرف

پڑھے جو کوئی یہ نادر کہانی ۔۔۔ تو دیکھے یہ میری گوہر فشانی

پڑھے اور آفریں مجکو کہے وہ ۔۔۔ ہمیشہ عشق میں ڈوبا رہے وہ

اگر مجنوں و لیلیٰ جیتے رہتے ۔۔۔ حدیث عشق اس دفتر سے لکھتے

ہے "باغ عشق" اس کا میں نے رکھا نام ۔۔۔ خدا کے فضل سے یہ ہو وے انجام[3]

ان مختصر حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں کی پرورش اور تعلیم و تربیت لالہ کھیم نرائن کے زیر سایہ ہوئی۔ یہ اپنے بڑے بھائی کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ انھوں نے ۲۵ سال کے عرصے میں سات کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں

ان کتابوں کے نام یہ ہیں:-

(۱) چار گلشن (۲) بہار عشق (۳) گلزار حسن (۴) دیوان جہاں (۵) گل صنوبر۔

(۶) تنبیہ الغافلین اور (۷) باغ عشق۔

اس طرح نمبر (۱) تا (۵) کی ترتیب "باغ عشق" کے مطابق ہے چونکہ آخری کتاب "باغ عشق" ہے اس لئے چھٹی کتاب تنبیہ الغافلین ہو سکتی ہے۔ اس داستان میں تنبیہ الغافلین کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ وہیں سے ارباب نثر اردو کے مؤلف نے اس کتاب کا نمونہ دیا ہے سید محمد اور پروفیسر جاوید نہال نے جہاں کی صرف تین کتابوں کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] باغ عشق قلمی نسخہ ورق ۶

[2] ھراپا غلط ہے صحیح سراپا ہے [3] قلمی نسخہ ورق ۶

"ان تین کتابوں کے علاوہ بینی نرائن جہان کی کسی اور تصنیف یا تالیف کا نشان نہیں ملتا" [1]

لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ بارغ عشق میں تنبیہ الغافلین کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ ہو سکتا ہے یہ کتاب لکھنے سے رہ گئی ہو۔ چونکہ مخطوطے کے آخر میں "الراقم مصنف" لکھا ہے اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ یہ نسخہ خود جہان کا لکھا ہوا ہے نسخے میں کہیں کہیں املا کی غلطیاں بھی ہیں۔ خط جلی اور صاف ہے۔ ہر سطر میں کم و بیش بارہ سطریں ہیں۔

"بارغ عشق" میں تین کتابوں بہار عشق، گلزار حسن اور گل صنوبر کے نام بالکل نئے ہیں۔ ان کا ذکر سوائے اس کتاب کے اور کہیں نہیں ملتا تفصیل حسب ذیل ہے

چار گلشن یہ رومانی داستان ہے جو شاہ کیواں کی بیدار بخت کی چاروں لڑکیوں کے ساتھ شادی کے بارے میں ہے۔ ان چاروں کے نام دل آرام، دلربا زیب النساء اور فرخندہ ہیں۔ یہ چاروں سگی بہنیں بڑی ذہین اور دانشمند تھیں۔ اس کتاب میں جہان نے ان ہی چاروں کی داستان دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ اس میں جہان نے اپنا مختصر حال بھی لکھا ہے۔

بہار عشق۔ اس داستان کا پتہ زیر نظر کتاب سے چلا ہے۔ یہ غالباً جہان کی دوسری داستان ہے جو بہار عشق کے نام سے لکھی۔ اس کے قلمی نسخے کا بھی کچھ پتہ نہیں۔

گلزار حسن۔ بارغ عشق کی ترتیب سے یہ جہان کی تیسری داستان ہے۔ جس کا پتہ زیر نظر داستان سے چلتا ہے۔ اس کے قلمی نسخے کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اس کا نام جہان نے گلزار حسن (یوسف زلیخا) رکھا۔

دیوان جہان۔ یہ اردو کے غیر معروف شاعروں کا تذکرہ ہے جو ۱۸۱۲ء میں جہان

---

[1] انیسویں صدی میں مغربی بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۰

نے بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا تھا۔ اس میں زیادہ تر شاعروں کے
کلام کا انتخاب ہے۔ یہ تذکرہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے مرتب کر کے شائع
کیا ہے۔ جہان کی "دیوان جہان" کے علاوہ باقی تمام کتابیں ابھی تک شائع نہ ہو سکیں۔

گل صنوبر۔ یہ بھی جہان کی تصنیف ہے اور میری دریافت ہے زیر نظر داستان میں اس
کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہار عشق اور گلزار حسن بھی دریافت کی ہیں۔

تنبیہ الغافلین۔ یہ مولوی شاہ رفیع الدین، مولوی شاہ ولی اللہ دہلوی کی فارسی کتاب
کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ جہان نے مولوی سید احمد بریلوی کے کہنے پر کیا تھا۔ یہ
۴۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ البتہ
زیر نظر داستان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

قصے کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

عرب کے کسی شہر میں ایک دولت مند شخص خجستہ نام کا رہتا تھا۔ یہ دنیا کی تمام
فکروں سے آزاد تھا۔ مگر اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ خدا سے ہر وقت یہی دعا
مانگتا کہ ایک فرزند اس کے یہاں پیدا ہو تاکہ اس کا نام و نشان باقی رہے۔ خدا
نے اسکی دعا قبول کی اور اس کے یہاں ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ خجستہ نے
اس کی خوشی میں ہر ایک غریب و فقیر کو غنی کر دیا اور نوکروں کو جاگیر و منصب
و انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ خجستہ نے اس کا نام قیس عنبری رکھا۔ اس کی
پرورش اور دیکھ بھال کے لئے نوکر اور دائیاں ملازم رکھیں تاکہ قیس کو کسی
قسم کی تکلیف نہ ہو۔ مگر قیس کو دائی کی گود میں کسی کل آرام نہ ملتا۔ سوائے
رونے کے اور کوئی کام اس کو نہ تھا۔

ایک روز ایک نازنین ماہ جبیں نے اسے گود میں اٹھا لیا قیس اس کی گود
میں چپکا ہو رہا اور اس نازنین کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ سب عورتیں بچے کی

یہ حالت دیکھ کر حیرت میں پڑ گئیں۔ بچہ اس نازنین کی گود سے جدا نہ ہوتا جب قیس کی گردش سال کی ہوئی تو اس کی رسم ختنہ سنت اسلام کے موافق ادا ہوئی۔ غریبوں اور محتاجوں کو روپیہ سے مالا مال کیا۔ غرض اس خوشی میں سات روز تک مجلس عیش و نشاط جمی رہی۔ اس کے بعد ایک عالی شان مکان میں اس کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مکتب آراستہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے عالم و فاضل اور عقلمند اتالیق مقرر کئے۔ اس مکتب میں محلے کے دوسرے بچے بھی پڑھنے کے لئے آیا کرتے۔ ان ہی بچوں میں ایک لڑکی لیلیٰ نام کی بھی تھی۔ قیس اس کو دیکھ کر اپنی بے قراری کو تسکین دیتا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل بالکل نہ لگتا۔ لیلیٰ کی رغبت بھی اس کی طرف ہونے لگی۔ اب یہیں سے ان دونوں کی لافانی محبت پروان چڑھنے لگی۔ ان دونوں کے عشق و محبت کے چرچے مکتب سے نکل کر گھر گھر پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی خبر لیلیٰ کی ماں کو پہنچی۔ قیس و لیلیٰ کو بھی یہ خبر مل گئی۔ ماں باپ کے خوف سے اب دونوں نظروں میں باتیں کرتے۔ کسی کے سامنے بات کرنا موقوف کر دیا۔ لیلیٰ کی حالت جذبۂ عشق میں ایسی ڈوبی کہ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ لیلیٰ کی ماں نے جب دوسرے لوگوں کی زبانی قیس و لیلیٰ کے عشق و محبت کے چرچے سنے تو اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور لیلیٰ کے دو طمانچے مارے اور خوب برا بھلا کہا اور بیٹی کو نصیحتیں کیں۔ لیلیٰ کا مکتب میں جانا بند ہو گیا۔

ادھر قیس کو مکتب ماتم سرا نظر آنے لگا۔ ہر چند اس کے ہم جماعت اس کو تسلی دیتے مگر اس کے دل پر کسی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخر کار اس کے ماں باپ کو بھی خبر ہو گئی۔ جنہوں نے بیٹے کو بہت سمجھایا مگر وہ اکلوتا فرزند

کب باز آنے والا تھا۔ اس نے چہرے پر تو محبت کی چادر ایسی اوڑھ رکھی تھی کہ وہ اس سے الگ ہٹ کر سوچنے اور سمجھنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ باپ نے پند و نصیحت کا کوئی اثر نہ پایا تو مجبوراً اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

مجنوں نے لیلیٰ کے فراق میں اپنے جسم کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور لباس فقیرانہ پہن کر اور اپنے کو اندھا بنا کر گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔ مجنوں اندھوں کی طرح لاٹھی ٹیکتا لیلیٰ کے محل کے اندر چلا گیا۔ وہاں اتفاق سے ایک گڑھا تھا۔ مجنوں کا پاؤں اس گڑھے میں جا پڑا۔ جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ اس کے چیخ و پکار کی آواز لیلیٰ کو پہنچی ماں کی اجازت سے اندر سے عاشق کو اُس نے دکھایا۔ ماں چونکہ سامنے بیٹھی تھی اس لئے اس کے خوف سے وہ مجنوں سے کچھ کہہ نہ سکی۔ دونوں میں اب محبت اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ ایک دوسرے کی آواز کو فوراً تاڑ جاتے۔ مجنوں کے باپ کو بیٹے کی خبر پہنچی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خود جا کر اس کو دیکھیں اور سمجھایا اس نے شادی کے لئے ایک سے ایک خوبصورت لڑکیوں کے نام لئے مگر مجنوں نے باپ کی ایک نہ مانی۔ لیلیٰ کے فراق میں وہ جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ سیکڑوں لوگ اس کو دیکھنے جاتے اور اس کی حالت کو دیکھ کر تاسف کرتے اسی حالت میں مجنوں کو کئی برس گذر گئے لیلیٰ کو ایک روز اچانک مجنوں کا خیال آگیا۔ ایک ہمراز کو اس کی تلاش میں بھیجا۔

مجنوں بھی لیلیٰ کے فراق میں دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ایک دن اس کے باپ نے عزیز و اقارب کو جمع کر کے بیٹے کے عشق و محبت کی داستان ان پر ظاہر کی۔ سب عزیز اس بات پر متفق ہوئے کہ لیلیٰ کے باپ کے پاس شادی کی درخواست کریں چنانچہ مجنوں اپنے عزیزوں کو ساتھ لے کر

لیلیٰ کے باپ کے پاس پہنچا۔ لیلیٰ کے باپ نے سب کی خاطر کی اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا۔ لیلیٰ کے باپ کو لوگوں نے مجنوں کے خلاف بہت کچھ بہکایا لیکن جب اس نے مجلس میں مجنوں کو خود دیکھا تو اس کا مغالطہ دور ہو گیا اور وہ بہت خوش ہوا۔ اتفاق سے اس وقت لیلیٰ کا کتا مجلس میں آ گیا بس پھر کیا تھا جذبۂ عشق نے غلبہ کیا اور وہ بھری مجلس سے کھڑا ہوا اور اپنے گریبان کو چاک کر ڈالا اور دوڑ کر کتے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور نہایت محبت سے اپنی آنکھیں اس کے پاؤں پر ملنے لگا۔ مجنوں کی اس حرکت پر لیلیٰ کا باپ ناراض ہو گیا۔ نتیجتہ مایوس ہو کر مجنوں کو اپنے ہمراہ واپس لے آیا۔ کئی روز بعد مجنوں آہ وزاری کرتا ہوا نجد کے جنگل کی طرف نکل گیا۔ باپ کسی صاحب کمال کے پاس پہنچا اور بیٹے کی حالت کا ذکر کیا۔ اس درویش نے مجنوں کی عجیب حالت دیکھی تو اس کو بھی ترس آ گیا۔ درویش نے بہت کچھ مجنوں کو سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہ مانا۔

ابن السلام نام کا ایک سردار عرب کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا بھی ایک لڑکا تھا جو لیلیٰ سے دل ہی دل میں محبت کرتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنا راز کسی راز دار کے ذریعہ اپنے باپ تک پہنچایا۔ باپ اس رشتے سے بہت خوش ہوا۔ ابن اسلام لیلیٰ کے باپ کے پاس اپنے لڑکے کو لیکر مع فوج اور قیمتی ساز وسامان کے پہنچا۔ لیلیٰ کا باپ یہ خبر سنکر بہت خوش ہوا بڑی خاطر تواضع ہوئی۔ لیلیٰ کا باپ عقد کے لیے تیار ہو گیا۔ غرض ابن اسلام کے لڑکے کا عقد لیلیٰ کے ساتھ کر دیا گیا۔ لیلیٰ کو جب اس کی خبر لگی تو اس کا گلا خشک ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اپنی سہیلیوں سے یہی کہا کہ مجنوں کے سوا میں نے کسی غیر مرد کا چہرہ آج تک نہیں دیکھا نہ دیکھوں گی۔ اس کے

سوا کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتی۔ لیلیٰ جب بیاہ کر اپنی سسرال گئی۔ شب عروسی کے روز لیلیٰ نے اپنے شوہر کے منہ میں ایک تھپڑ ایسا مارا کہ وہ تخت کے نیچے جا کر گرا اور اس سے یوں کو یا ہوئی۔

"اے موذی تو چاہتا ہے کہ میرے دامن عصمت کو گناہ سے آلودہ کرے یہ ہرگز نہ ہوگا۔ یہ میوہ دوسرے شخص کی امانت ہے"

مجنوں بجائے جنگل میں ایک پتھر کا تکیہ لگائے بیٹھا ہوا تھا کہ کبڑی بڑھیا نے اس کو خبر دی کہ لیلیٰ نے شادی کر لی۔ خبر کے سنتے ہی اس کے ہوش ٹھکانے نہ رہے مجنوں نے لیلیٰ کو یہ شکایتی خط لکھا۔ لیلیٰ نے بھی اس کا تسلی بخش جواب دیا کہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ مجنوں جنگل سے لیلیٰ کی تلاش میں اس طرح نکلا کہ اس کو بچے — مجنوں سمجھ کر پتھر مارنے لگے اس کی گلی میں گیا تو دونوں کی نظریں ملیں۔ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لیلیٰ بھی بے قرار ہو گئی۔ ایک دن لیلیٰ محتاجوں کو کھانا تقسیم کر رہی تھی۔ اسی میں مجنوں بھی ہاتھ میں پیالہ لئے وہاں جا پہنچا۔ لیلیٰ نے اپنے عاشق صادق کو پہچان لیا۔ اس نے ایک چمچا اس زور سے اس کے پیالے میں مارا کہ اس کا پاس ٹوٹ گیا۔ دوسرے فقیر اس کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ نوفل بادشاہ نے جب مجنوں کی داستان عشق سنی تو بہت افسوس کیا۔ اس نے لیلیٰ کے باپ کے پاس شادی کا پیام بھیجا۔ لیلیٰ کے باپ نے نوفل کے پاس لکھ بھیجا کہ یہ رشتہ منظور نہیں۔ نوفل کو اس بات پر غصہ آگیا۔ مقابلے کے لئے فوج لے کر اس کے ملک میں جا پہنچا۔ دونوں میں جنگ ہوئی۔ اس میں ہزاروں آدمی مارے گئے آخر فتح نوفل کی ہوئی۔ لیلیٰ کو نوفل نے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گیا مگر خود ہی اپنی موت مارا گیا۔ لیلیٰ کا باپ بیٹی کو اپنے گھر لے گیا۔ مجنوں کو جب خبر لگی تو وہ لیلیٰ کی یاد میں ڈھاڑے مار مار کر رونے لگا ادھر لیلیٰ کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

یہاں تک۔ کہ مجنوں کے فراق میں اس نے جان دے دی۔ لیلیٰ کے مرنے کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ لیلیٰ کی ماں بیٹی کے مرنے کی خبر سنانے مجنوں کے پاس گئی اور اس سے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔ مجنوں خبر سنتے ہی بیہوش ہو گیا اور زمین پہ گر پڑا مجنوں کی یہ حالت دیکھ کر لیلیٰ کی ماں گھر واپس لوٹ گئی۔ مجنوں بھی چل بسا تمام جنگل کے جانوروں نے اس کے مرتے ہی اس کی لاش کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور رونے لگے۔

داستان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہان نے اس میں دلچسپی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اور ترجمہ کو اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ ان کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ داستان بے حد دلچسپ اور موثر ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی تلاش میں اپنی ہمراز کو بھیجتی ہے۔ اس سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہتی ہے کہ

"ہر چند کہ اس آرام جاں کو تیسے جیتے جی ملنے کی امید نہیں لیکن یہ جانتی ہوں کہ پھول کی چوٹ بھی اس کے جسم نازک پہ نہ پہنچے اور صدمات زمانہ سے بچا رہے۔ اگر ہماری اور اس کی سلامتی ہے تو ایک نہ ایک دن اس سے ملاقات ہو ہی رہے گی۔"

لیلیٰ کی بے قراری جب بڑھ گئی تو اس کی سہیلیوں نے اس کے غم کو کم کرنے کے لئے جنگل کی سیر کا مشورہ دیا۔ سہیلیوں کے ہمراہ جنگل پہنچی مگر لیلیٰ کا جنون عشق برابر بڑھتا ہی گیا چنانچہ سہیلیاں لیلیٰ کو گھر واپس لے آئیں۔

خجستہ بیٹے کی تلاش میں مجنوں کے جنگل میں پہنچا بہت سمجھایا مگر نہیں مانا لیکن لیلیٰ کے بلانے کا بہانہ کر کے وہ بیٹے کو گھر لے آیا اور اس کی ماں کے سپرد کر دیا۔ ماں نے بیٹے کی حالت دیکھی تو بے ہوش ہو گئی۔ ماں کی ممتا قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قلمی نسخہ ص

"الغرض بڑے پیار محبت سے اس کی بلائیں لے کر اپنی گود میں بٹھالیا اور
حجامت بنوا غسل دلوا پوشاک نفیس اس کے جسم گلرنگ میں پہنائی اور
کھانے اچھے ستھرے لطیف لاکر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ جب مجنوں
نے تھوڑا سا کھانا تناول کیا ماں باپ نے اس کو ایک مسند عالی پہ بٹھایا
اور باتیں نصیحت آمیز کرنے لگے"۔[1]

ماں باپ کی محبت کا یہ رنگ کتنا گہرا اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس کے ایک
ایک لفظ میں محبت کا رس بھرا ہے۔

*

مجنوں کو جب لیلی کی شادی کی خبر ملی تو اس کے دل پہ سخت چوٹ لگی۔ اس کے
دکھ کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے لیلی کو لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

"اے مہر سپہر بیوفائی اور اے عہد شکن شوخی و دلربائی جو قول و قرار کہ تو نے
مجھسے کئے تھے وہ سب بھولے اور یاد اس شکستہ بال کی ایک قلم
دل سے دھو ڈالی۔ کیا کیا دکھ میں نے تیرے واسطے سہے اور کیسی کیسی
مصیبت تیرے لئے گوارا کی۔ آخر ثمر اس کا یہی تھا کہ اس میوۂ چمن زار
شباب سے اور سب بہرہ مند ہوں اور میں بے نصیب رہوں۔ میں نے
تیرے وعدہ ہائے خلاف کو سچا جان کر وفا ثابت اپنی طرف کرتا رہا اور
تیرے آرزوئے وصال میں دن رات مرتا رہا۔ انسانوں سے کنارہ کیا
وحشیوں کی مانند جنگلوں کا رہنا اختیار کیا۔ اپنے بیگانے کی ملامت گوارا
کی سنگ طفلاں کو آر جانا اے بیوفا عوض ان باتوں کا یہی تھا جو تجھ
سے ظہور میں آیا ہم تو آتش فراق میں یوں پڑے جلیں اور تم دوسرے
کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ اور گلچھرے اڑاؤ کچھ بھی دل میں کچھ

---

[1] قلمی نسخہ ورق ۲۵

اور مستقیم حقیقی سے دور خدا حاضر ناظر ہے۔ اس دو چار دن کی زندگی پر مغرور ہو کر اس عاشق بیدل کے جگر پر آرے چلانے کون مذہب میں روا ہے۔"[1]

مجنوں کا جب یہ خط لیلیٰ کے پاس پہنچا تو اس کو بے حد افسوس ہوا اس کو پڑھ کر جو تاثر اس کے دل پر ہوا وہ لیلیٰ نے اس کو جواب میں لکھ بھیجا۔ ملاحظہ ہو۔

"اے چاہنے والوں کے بادشاہ اور اے عاشقوں کے شاہنشاہ جو قول و جو قول و قرار میں نے تجھ سے کیے ہیں روز ابد تک مضبوط قائم رہیں گے اس میں سر مو فرق نہ ہوگا شکر خورے کو کیا مقدور اور کتنی طاقت کہ اس غنچہ ناشگفتہ کی شیرینی سے حاصل کرے اور مکھی کو کیا تاب کہ اس شہد کے گرد پر مار سکے لیکن جو خبر موحش کہ تیرے گوش زد ہوئی ہے وہ بھی سچ ہے لیکن میں کیا کروں اس میں کچھ اختیار میرا نہ تھا۔ ناگہانی یہ بدنامی میرے سر پر چڑھی لیکن جو چیز کہ میرے اختیار کی تھی اس سے دور بے نصیب رہا۔ یہ خیال خام دل میں نہ لا کہ میں بغیر تیرے ایک دم شاد ہوں بلکہ بغیر تیرے خانماں برباد ہوں۔ . . . . اس صحرا نوردی اور بیابان گردی میں جو کانٹا کہ تیرے بدن نازک میں چبھتا ہے صدمہ اس کا میرے جگر میں پہنچتا ہے اور جو آبلہ کہ تیرے پا سے فگار میں ٹوٹتا ہے پانی اس کا میری آنکھوں سے جاری ہوتا ہے . . . . ہر چند کہ تیری جدائی کے غم سے طاقت فریاد کی بھی نہیں لیکن کیا کروں مجبور ہوں [illegible]

---

[1] قلمی نسخہ دمشق ۵۸، ۵۹

[2] قلمی نسخہ دمشق ۵۹، ۶۰

لیلیٰ کا یہ خط محبت سے لبریز ہے۔ اس میں لافانی محبت کا وہ عکس ہے جو مجنوں کو ڈھارس بندھانے میں معاون نظر آتا ہے۔ لیلیٰ کی تڑپ اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

لیلیٰ کو مجنوں سے بے حد پیار ہے۔ وہ شریف اور نیک خصلت ہے ماں باپ کی عزت کا اس کو لحاظ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مجنوں کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتی اور نہ اس کے بغیر جی سکتی ہے۔ مجنوں کا کردار بھی اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا وہ بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیلیٰ مجنوں دونوں کے نام ایک دوسرے سے ایسے پیوست ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں محبت کا ایک گہرا رچاؤ کارفرما ہے جو دوسری داستانوں میں کم پایا جاتا ہے۔

جہآن کی یہ داستان اپنے عہد کی ایک کامیاب داستان کہی جا سکتی ہے۔ جہآن نے اس میں اپنی محبت کی خوب زور دکھایا ہے۔ بیان میں سادگی اور روانی ہے۔ اسلوب نگارش بھی جاندار ہے۔ داستان کے کردار سادے ہیں کہ ان میں چھل فریب کہیں نظر نہیں آتا۔ لیلیٰ سب کے سامنے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی بلکہ مجنوں کے خط کے جواب میں محبت کا جس انداز سے اظہار کرتی ہے وہ داد کی مستحق ہے۔ اس داستان میں ہیروئن لیلیٰ اور ہیرو مجنوں ہے۔ لیلیٰ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کردی گئی تاہم اس نے مجنوں کے سوا شوہر کی شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کی تھی کہ لیلیٰ نے مجنوں کے فراق میں اپنی جان تک دیدی۔ واقعی اس کی محبت لافانی ہے۔ مجنوں نجد کے جنگلوں میں اسکی خاطر مارا مارا پھرا۔ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ مجنوں نے اینٹیں اور پتھروں سے اس کی ناطر کی یہ سب کچھ اس نے لیلیٰ کی محبت میں برداشت کیا اور مجنوں نے بھی لیلیٰ کے مرنے کی خبر سنکر جان دیدی۔

جہآن کا یہ قلمی نسخہ صاف اور نستعلیق خط میں ہے۔ جہآن نے اس میں جگہ جگہ اشعار بھی دیئے ہیں جس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے قیاس کہتا ہے کہ یہ نسخہ مولف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ آخر میں "راقم مصنف" لکھا ہے۔ سرورق پر دو چھوٹی مہریں ہیں جو صاف نہیں کہیں کہیں املا کی غلطیاں بھی ہیں۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔

اردو داستانوں میں منظر کشی اور تکرار

داستان گوئی اور غزل گوئی میں ذرا ہی سا فرق ہے۔ وہی عشق و عاشقی کے جھگڑے رقیبوں کی عداوتیں اور قتل و غارت گری وغیرہ۔ لیکن یہ داستان میں ایک بڑے پیمانے پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح غزل گوئی میں منظر کشی اور نیچر کی طرف جو بے توجہی برتی گئی وہ بدرجہ اتم داستانوں میں بھی موجود ہے۔ صبح کے متعلق غزلوں میں زیادہ سے زیادہ یاد صبح گاہی چلتی ہے یا وصال کی شب یا تاریکی ہجر کو دور کرنے والی مرغ کی اذان۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی حال داستانوں میں ہے۔

داستانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ منظر کشی قصے کی دلچسپی میں حسن پیدا کر دیتی ہے۔ "باغ و بہار" کا یہ منظر کس قدر دلچسپ اور پُر اثر انداز ہے اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

"سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا تب خدا ہی یاد آتا ہے۔ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانہ کا تماشا سنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ ملکہ کے منہ میں ایک کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی اور پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا ہلدی سا بن گیا۔ منہ میں پھیپھڑی بندھ گئی آنکھیں پتھرا گئیں مگر ایک دم اٹکا رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو ایک درویش خضر کی سی صورت

نورانی چہرہ روشن دل آکر پیدا ہوا۔ ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا۔ "اے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا ہوا تھا۔ اب اس فقیر بوڑھے کو اپنا خادم سمجھ اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ خدا خوب کرے گا۔ اور فقیر کے کچکول میں جو ٹکڑے بھیک کے موجود تھے ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا دیکھے تو ایک کنواں تو ہے پر ڈول رسی کہاں جس سے پانی بھرے تھوڑے پتے درخت سے توڑ کر دونا بنایا اور اپنی سیلی کھول کر اس میں باندھ کر نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا۔ اس مرد خدا نے بے کسی اور بے بسی جان کر بہت سی تسلی دی خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غمخواری اور دلداری اس کی بے حد دیکھی تب ان کے بھی مزاج کو استقلال ہوا۔ اس روز سے اس پیر مرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے کے لیے شہر میں نکل جاتا جو ٹکڑا پارچہ پاتا ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔ اس طرح سے تھوڑے روز گذر گئے"

درویش کو ملکہ کی بے کسی پر رحم آگیا اور اس نے اس کی بے ہوشی دور کرنے کے لئے جو تدبیریں کیں وہ داد کی مستحق ہیں۔ ملکہ کے دل پر بھی درویش کی اس خدمت کا اثر ہوا منظر نہایت دلچسپ ہے آگے چل کر میر امن لکھتے ہیں کہ۔

"ایک دن ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جوں ہی مباف کھولا چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ گول آبدار نکل پڑا۔ ملکہ نے اس درویش کو دیا اور کہا۔ شہر میں سے اس کو بیچ لاؤ وہ فقیر اس گوہر کو بیچ کر اس کی قیمت بادشاہزادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم کیا کہ ایک مکان موافق گذران کے اس جگہ بنوا دو۔ فقیر نے کہا اے

بیٹی بانیو دیوار کی کھود کر تھوڑی سی مٹی جمع کر و ۔ ایک دن میں پانی لاکر گارا کر کر گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔ ملکہ نے اس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا۔ زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ملکہ نے اس کو اور صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے چار پانچ لپ اشرفیوں کی لے کر پھر بند کیا اور مٹی دیکر اوپر سے ہموار کر دیا۔ اتنے میں فقیر آیا۔ ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار کاریگر اور اپنے کام کے استاد اور مزدور جلد دست بلاؤ جو اس مکان پر ایک عمارت بادشاہانہ کہ طاق کسریٰ کا جفت ہو اور قصر رحمان کے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو جلد تیار کریں۔ لیکن پہلے نقشہ ان کا ایک کاغذ پر درست کر کے حضور میں لادیں جو پسند کیا جائے "۔ [۱]

میر امن نے قصے کو بیان کرنے میں منظر کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔ باغ و بہار میں یہ خوبیاں جا بجا نظر آتی ہیں اس سے قصے کے بہت سے واضح نقوش بھی سامنے آجاتے ہیں ۔ اور جو مثال پیش کی گئی ہے اس میں تکرار بالکل نہیں پائی جاتی ۔ منظر کی دل کشی پیدا کرنے کے لیے قصے کو جان دار بنایا گیا ہے تاکہ قاری کی طبیعت اُچاٹ نہ ہو۔ لیکن بہت سی داستانیں ایسی بھی ہیں جن میں منظر کشی نہایت دھندلی اور غیر واضح ہے اور تکرار بھی قدم قدم پر داستان کی قدر و قیمت کم کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ البتہ بڑی بڑی ضخیم داستانوں میں تکرار کا ہونا ایک عام بات ہے لیکن اس سے داستان کے حسن پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ہاں مختصر داستانوں میں تکرار کا عیب داستان کی خوبیوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے ۔ " نو طرز مرصع " سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

" اس عرصے میں فرخندہ سیر کے تیئیں دور سے یہ فاصلہ فرسنگ کے ایک چراغ نظر آیا لیکن باوصف استبداد باد صرصر کے زنہار اشتعالہ، چراغ کے تیئیں سر مو حرکت نہ تھی "۔

---

[۱] باغ و بہار ص ۱۰۰، ۱۰۱ ۔

اس میں تیغ کے لفظ کو بار بار دہرایا گیا ہے جس سے عبارت کی خوبصورتی محض تکرار کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اب موازنے کے لیے "طلسم ناریک" سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ "ناگاہ جلاد زریں پوش تیغۂ مہر ہاتھ میں لیے میدان چرخ زبرجدی میں آیا۔"

۲۔ پہلوان زریں پوش نے سلاح جنگ ذات پر آراستہ کرکے نیزہ خطوط شعاعی ہاتھ میں لیا اور تیغۂ مہر کو ..... اکھاڑے میں چرخ زبرجدی کے آیا۔

۳۔ پہلوان زریں پوش اکھاڑے میں مغرب کے گیا اور شہنشاہ ماہ تاباں مع فوج سپر نیلگوں پر جمع ہوا۔

۴۔ سپیدۂ سحری چمکا اور شہنشاہ انجم سپاہ خلوت سرائے مغرب میں گیا اور آفتاب تاباں فلک زبرجدی پر آیا۔"

۵۔ ساحر شب گرد ماہتاب گردش کرکے داخل قلعۂ مغرب ہوا اور شہنشاہ زریں پوش مع فوج ضیاو شعاع چرخ زبرجدی پر آیا۔

۶۔ لیلیٰ شب نے برقع سیاہ چہرہ پر ڈالا۔

۷۔ قیدی زنداں مغرب زنجیر ہائے شعاع میں جکڑا ہوا فلک نیلوفری پر آیا۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ آیئے ان پر غور کریں تکرار حد سے زیادہ ہے اور تحریر بے اثر ہے۔ مصنف کو صبح سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اس کا کوئی حقیقی منظر کھینچنا نہیں چاہتا۔ اسے صرف اتنا کہنا ہے کہ چاند غروب ہوا اور سورج طلوع ہوا یا سورج غروب ہوا۔ اور چاند مع ستاروں کے طلوع ہوا۔ اس تکرار مسلسل پر حسن بیان کا پردہ ڈالا جاتا ہے۔ وہ ناقص ہی سہی مگر پردہ ضرور ہے۔ آسمان کو آسمان یا آکاش لکھنا آسان پسندی تھی یا شان شکست تھا۔ چنانچہ داستان گو فلک زبرجدی چرخ زبرجدی و نیلوفری سے نیچے قدم ہی نہیں رکھتا۔ سورج کو ہمیشہ شہنشاہ یا پہلوان سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس کے باوجود چند خوبیاں بھی ہیں "لیلیٰ شب نے برقع سیاہ چہرے پر ڈالا" تشبیہ کو بخوبی

ادا کرنے کی وجہ سے کچھ گہن لگ گیا ہے۔ اسی طرح ساحر "شب گرد ماہتاب" حسین استعارہ ہے۔ مگر قلعہ مغرب نے سارے مطلب کو خبط کر دیا۔ جہاں تک بقیہ منظر کشی کا تعلق ہے وہ بے کار ہے۔ قتل کی صبح ہے تو سورج جلاد ہے کشتی کی ہے۔ تو پہلوان زبردست سہی کہ جس شخص کو سورج نکلنے پر موت کا حکم ہو۔ اسے سورج اور جلاد میں کم فرق محسوس ہو گا۔ مگر چیز کو بیان کرنے کا اندازہ ہوتا ہے یہ نہیں کہ جلاد فلک تیغۂ حمائل کر کے افق پر آ کودا۔ اس قسم کی تشبیہیں بہت ہی عام ہیں ہر شخص لکھ سکتا ہے۔ عیار کی آمد ہے تو صبح کو لکھا کہ عیار زریں پوش ہائے شعاع لے کر چرخ زبرجدی میں آیا اور نقاب دار زریں نے اسپ شعاع میدان جنگ میں مہمیز کیا یا ساحر زریں پوش نے سحر نورانی..... اس میں تخیلی کارنامہ نہیں۔ ایک اور امر قابل غور ہے کہ یہ سب مثالیں میں نے قمر کی داستان میں سے لی ہیں۔ جاہ جنہوں نے طلسم ہوش ربا کی شروع کی چار جلدیں تصنیف کی تھیں وہ ندرت بیان میں حد درجہ کمال رکھتے ہیں۔ ان کے منظر چاہے وہ کسی بھی چیز کے متعلق کیوں نہ ہوں زیادہ شگفتہ اور موزوں ہیں۔

کتابیات

۱۔ آب حیات — محمد حسین آزاد — نولکشور، لاہور ۱۹۰۷ء

۲۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۳۔ ارباب نثر اردو — سید محمد ایم۔اے — مطبوعہ حیدر آباد دکن

۴۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر محمد احسن فاروقی — فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۴ء

۵۔ اردو کی نثری داستانیں — ڈاکٹر گیان چند — انجمن ترقی اردو کراچی

۶۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب — پروفیسر جاوید نہال — اردو رائٹرس گلڈ کلکتہ

۷۔ تاریخ اردو ادب — رام بابو سکسینہ — نولکشور پریس لکھنؤ

۸۔ تاریخ نثر اردو — احسن مارہروی — رام نرائن لعل اگروال۔ آگرہ

۹۔ خطبات گارساں دتاسی — دتاسی — انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن

۱۰۔ داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — طاہر بک ایجنسی دہلی

۱۱۔ داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری — رام نرائن لال اگروال آگرہ

۱۲۔ فسانۂ عجائب — اطہر پرویز (مرتب) — سنگم پبلشر الہ آباد ۱۹۶۹ء

۱۳۔ فن داستان گوئی — کلیم الدین احمد

۱۴۔ گل کرسٹ اور اسکا عہد — محمد عتیق صدیقی — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، دلی

۱۵۔ نیا افسانہ — وقار عظیم — ادارہ فروغ اردو لاہور

۱۶۔ نئے ادبی رجحانات — ڈاکٹر اعجاز حسین — اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۴۲ء

۱۷۔ ہماری داستانیں — وقار عظیم — ادارہ فروغ اردو لاہور

۱۸۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات — نصیر الدین ہاشمی — مطبوعہ حیدر آباد دکن

اشاریہ

مصنف کی چند قابل قدر کتابیں

اردو کے کلاسیکی شعراء پر تنقیدی مضامین !!

(میر سے فراق تک)

مولفہ

ایم ۔ حبیب خاں

"ایم ۔ حبیب خاں صاحب نے میر سے فراق تک کے اکابر شعراء کا تعارف مستند اہل قلم کے مضامین سے کرایا ہے ۔ یہ سلسلہ تین جلدوں پر مشتمل ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ مولف نے بڑا اچھا اور ضروری کام انجام دیا ہے ۔ میر سے فراق تک کی کوئی مکمل تاریخ مرتب کی جاتی تو کبھی ان مقالات اور ان کے لکھنے والوں سے مدد لینی پڑتی ۔ اگر ناظرین توجہ اور محنت سے کام لیں تو وہ ان مقالات کو سامنے رکھ کر تھوڑی ترمیم و اضافے کے بعد اس عہد کی تہذیب اور شعر و ادب کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں ۔

مولف کی مرتب کی ہوئی یہ جلدیں اردو شعر و ادب کے علماء و ادباء دونوں کے لیے نہایت قابل قدر ہیں جن کے لیے مرتب ہمارے تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں "

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

قیمت : فی جلد ۶ روپے

اردو تنقید کے معمار

مرتبہ : ایم ۔ حبیب خاں

یہ اردو کے اہم نقادوں کے فن اور کارناموں پر منفرد اور مکمل مضامین کا مجموعہ ہے ۔ ابتدا میں اردو تنقید کی تاریخ اور تنقید کی خوبیاں، اور آخر میں اردو تنقید کے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ ہے ۔ ایم حبیب خاں نے یہ کتاب بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کی ہے اس میں حسب ذیل تنقیدی مضامین شامل ہیں :

حالی، شبلی، عبدالحق، فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، اختر انصاری

قیمت : چھ روپے

افکارِ میر

مولفہ

ایم۔ حبیب خاں

"ایم۔ حبیب خاں صاحب تالیفی کاموں کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی مختلف موضوعات پر اسی نوعیت کی کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ اس میں انھوں نے میر کے متعلق اہم اور معنی خیز تحقیقی و تنقیدی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ انھوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ میر کی شخصیت یا فن سے متعلق وہی مضامین شامل کیے جائیں جن میں لکھنے والوں نے اپنے اپنے دائرے میں میر کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

ایم۔ حبیب خاں صاحب ان مولفین یا مترجمین میں نہیں ہیں۔ جو محض دوسروں کے مضامین جمع کر دیتے ہیں۔ لیکن خود کسی موضوع پر کچھ لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے جن لوگوں نے کلاسیکی شعراء کے سلسلہ کی تنقیدی کتابیں پڑھی ہیں انھیں اندازہ ہوگا۔ کہ خود بھی بعض اہم شاعروں پر انھوں نے مضامین لکھے ہیں اور تحقیق و تنقید دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ میر کے متعلق بھی جو پہلو تشنہ رہ گئے تھے اور جن پر دوسروں کے اچھے مضامین موجود نہیں اس پر انھوں نے خود مضامین لکھ کر اس کتاب کو ہر طرح سے جامع اور مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مطالعہ میر کے سلسلے میں استناد کا درجہ حاصل کرے گی"۔

(ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی)

قیمت : بارہ روپے

ملنے کا پتہ

انڈین بک ہاؤس۔ علی گڑھ

اردو کی قدیم داستانیں

ایم۔ حبیب خاں

ایم حبیب خاں صاحب اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں سلیقے سے مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ جن میں "اردو تنقید کے معمار"، "اردو کے کلاسیکی شعراء" اور "افکار میر" بہت اہم ہیں۔ "اردو کی قدیم داستانیں" میں ان کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیت نمایاں ہوئی ہے۔ اس کتاب کا تعارف ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو نیز ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی نے مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف نے "پیش لفظ" میں کتاب کے مندرجات کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ

"اس مجموعے کے تمام مضامین اردو کی قدیم داستانوں پر ہیں۔ یہ مضامین کچھ پرانے، کچھ نئے، اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ "باغ عشق" اردو کی غیر مطبوعہ داستان ہے جو میری دریافت ہے اس کے علاوہ بینی نرائن جہاں کی "بہار عشق"، "گلشن حسن" اور "گل صنوبر" بھی میری دریافت کی ہوئی داستانیں ہیں۔

اس بیان سے مصنف کی تحقیقی کاوشوں کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ "اردو کی قدیم داستانیں" میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔ (۱) طلسم نارنج (۲) طلسم ہفت پیکر (۳) طلسم خیال سکندری (۴) کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔ (۵) باغ و بہار (۶) باغ عشق (۷) اردو داستانوں میں منظر کشی اور تکرار۔ نوعیت کے اعتبار سے ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) تنقیدی مضامین جن میں باغ و بہار اور کہانی رانی کیتکی پر مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۲) تحقیقی مضامین جن میں "باغ عشق" پر بہت اہم مقالہ ہے۔ منشی بینی جہاں نے جامی کے منظوم قصے لیلیٰ مجنوں کو "باغ عشق" کے نام سے اردو کا پیکر عطا کیا تھا اس داستان کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو اس مضمون کے ذریعہ ایم حبیب خاں صاحب نے اردو دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ ایم حبیب خاں صاحب نے داستانوں پر تنقیدی و تحقیقی کام کر کے یقیناً ایک اچھا اور قابل قدر کام کیا ہے۔ یہ کتاب طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔"

سائز ۲۲×۱۸ قیمت: آٹھ روپے

(ڈاکٹر عنوان چشتی)

...کی ہو... عرف ... اہم ...

... توجہ کی ہے اور جہاں انھوں نے

معروف قدیم دا... ...روشناس کرایا ہے، جن سے لوگ عام

طور پر واقف نہیں۔ ... ...مرے کے مرتب کی حیثیت سے جانے جاتے

تھے اب ایک داستان ... ...ہیں۔ ان کی غیر مطبوعہ داستان "باغ عشق" پر مولف

کا مضمون پڑھنے کے قابل ...

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعۂ مضامین دلچسپی سے پڑھا جائیگا اور طلباء اور اساتذہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے

(ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو)

داستانیں ہمارے ادب کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ ہماری قدیم زبان اور کلچر کی پاسبان بھی ہیں اور کرداروں کے ایسے جیتے جاگتے نمونے بھی سامنے لاتی ہیں جو قاری کے ذہن کو زندگی کی جدوجہد پر اکسانے اور انکے اندر مہم جوئی اور جذبۂ عمل کی سوئی ہوئی قوتوں کو جھنجھوڑ کر جگانے میں مسیحائی کا کرشمہ دکھاتی ہیں۔ ادھر تیس چالیس سال سے ہمارے نوجوانوں خصوصاً طالب علموں میں داستانوں سے دلچسپی کچھ کم ہوتی جا رہی ہے یہ اردو ادب کے حق میں اچھی بات نہیں۔ ان حالات میں داستانوں پر ایم حبیب خاں صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب داستانوں کی اہمیت کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانے اور ان میں دلچسپی پیدا کرنے میں خاطر خواہ معاون ثابت ہوگی۔

اس مجموعے میں ایسی داستانیں بھی ہیں جن کی نشان دہی کی اولیت کا سہرا حبیب خاں صاحب کے سر ہے۔ ان میں سے ایک داستان "باغ عشق" پر ان کا مفصل مضمون شامل کتاب ہے۔

ایم۔ حبیب خاں صاحب اپنی اس بروقت تصنیف کے لئے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(خواجہ مسعود علی ذوقی)

ایم۔ حبیب خاں صاحب، جو انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے کے ناظم ہیں اور گزشتہ اٹھارہ سال سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھ رہے ہیں، اس سے پہلے کئی کتابیں تالیف کر چکے ہیں جنھوں نے علمی و ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف "اردو کی قدیم داستانیں" اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع ہو رہی ہے۔ زیر نظر تصنیف میں اردو کی قدیم داستانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں ایسی داستانیں بھی شامل ہیں جو عام طور پر معروف ہیں اور ایسی بھی ہیں جن کا تعارف پہلی دفعہ حبیب خاں صاحب کرا رہے ہیں۔ بالخصوص بینی نرائن جہاں کی "باغ عشق" جس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ______ کو روشنی میں لا کر حبیب خاں صاحب نے اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔

امید ہے کہ ان کی یہ کوشش مشکور ہوگی اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا

(ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی)